اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا (ہمایوں)

یادگار علامۂ فصیلے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایوں

ایڈیٹر - بشیر احمد - بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائینٹ ایڈیٹر - حامد علی خاں - بی، اے

فہرستِ مضامین بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۴ء

جلد ۵ — نمبر ۱

اُجرت نامۂ اشتہار رسالۂ ہمایوں

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ
۱۲	۸۴ روپے	۴۲ روپے
۶	۴۲ روپے	۲۳ روپے
۳	۲۳ روپے	۱۳ روپے
۱	۸ روپے	۴ روپے

ؒله ہمارے کاتب صاحب کی بے توجہی کی وجہ سے اُجرت نامہ ماہ دسمبر میں غلطی ہوگئی بجائے ۸ کے ۶ لکھے گئے لہذا وہ غلط تصور کریں

تصویر[له] — یہ مشہور تصویر ایک انگریز نقاش سر ولیم اور چرڈسن کے مُوقلم کا نتیجہ ہے. سنہ ۱۸۸۰ء میں اسے حکومت نے دو ہزار پونڈ میں خریدا اور اب یہ لندن کے مشہور تصویر خانے ٹیٹ گیلری میں موجود ہے، اس بے بسی کے عالم میں بھی نپولین کی پُر رعب شخصیت کا خاکہ خوب کھینچا ہے جہاز فرانس کے ساحل سے دور ہوجاتا ہے اور نپولین آخری بار فرانس کو دیکھ رہا ہے، اسکے پیچھے درد و مصیبت کے وہ ساتھ ہمدرد کھڑے ہیں جنہوں نے اپنی خوشی سے جلاوطنی اور غربت میں اُس کا ساتھ دیا +

حمد

تیری حمد کس سے ہو اے خدا تو علیم ہے تو حکیم ہے
تری شان شانِ جدید ہے تری ذات ذاتِ قدیم ہے

تو وہ ہست و بود کا نور ہے کہ تجھی سے سب کا ظہور ہے
تو ہی جانِ دل کا شعور ہے تو ہی روحِ عقلِ سلیم ہے

ترے رنگ و بو ہی سے دشتِ دہر ہے صحنِ گلشنِ آرزو
تو وہ پھول ہے کہ فضائے ارض و سما میں تیری شمیم ہے

ترے لطف کی جو صدا اٹھی تو کلی کلی ہوئی بے کلی
تو گلوں کے دل کی ہے گدگدی تو چمن چمن کی نسیم ہے

یہ خمار ہے تری دید کا کہ ہے گل سے نکہتِ گل جدا
تری آمد آمدِ جانفزا تو بہارِ باغِ نعیم ہے

تجھے ڈھونڈھتے ہیں کہاں کہاں؟ گل راستی ہے ترا نشاں
ہے بشر کی روح ترا مکاں تو ہر ایک دل میں مقیم ہے

تو زباں زباں کی ہے گفتگو ترا ذکر کیسے کیا کریں
ترا شکر کیسے ادا کریں ترا لطف لطفِ عمیم ہے

کبھی دم کے دم بھی تو آ گیا تو پیامِ عشق سنا گیا
وہی جانے جس کو دکھا گیا کہ تو نورِ چشمِ کلیم ہے

جو ترا بنا جو ترا ہُوا وہ جہاں کے غم سے رہا ہُوا
نہ پھر اُس کو فکرِ علیف ہے نہ پھر اسکو خوفِ غنیم ہے

ترے دُکھ میں ہمکو وہ سکھ ملا کبھی دل نے پھر نہ کیا گلہ
تھی تری سزا بھی ترا صلہ تُو حفیظ ہے تُو حلیم ہے

تری کلفتیں بھی ہیں اُلفتیں تری زحمتیں بھی ہیں رحمتیں
ترا ظلم رحم ستم کرم تُو رحیم ہے تُو کریم ہے

مری جاں نے تجھ سے یہی کہا کہ کبھی تو جلوہ مجھے دکھا
مرے دل میں آ اے مرے خُدا کہ وہ تیرا دُرِ یتیم ہے

مجھے کُلفتوں کی خوشی دکھا مرے دل میں اپنا دیا جلا
مرے کذب کو رہِ حق پہ لا یہ دُعائے زارِ لئیم ہے

د ب

بزمِ ہمایوں

پچھلی باتیں

خدا کا شکر ہے کہ آج ہمایوں نے تیسرے سال میں قدم رکھا ہے!

سب کچھ دیکھا جائے تو کہنا پڑیگا کہ اسکی عمر کا دوسرا سال پہلے سے کسی طرح کم تسلی بخش نہیں رہا۔ اشاعتِ مضامین ناظرین کی توجہ، عام اثر ہر لحاظ سے حالت بہتر ہے اور ہمارے ارادوں میں اگر اور کچھ نہیں تو کم سے کم ترقی کی خواہش نے ایک ہلکی سی بے چینی ضرور پیدا کر رکھی ہے۔ اس میں سوائے اس خیال کے کہ ہمایوں چلتا رہے ایڈیٹر کو بہت کم دخل رہا۔ یہ زیادہ تر اُن دوستوں کے ہمت دلانے اور مدد کرنیکا نتیجہ ہے کہ یہ مہینے کے مہینے بول پڑنے والی صورت ابھی تک زندہ ہے۔

پہلے مجھے جائنٹ ایڈیٹر کی خاص توجہ اور محنت مینیجر کی ان تھک کوشش اور کاتب اور مطبع والوں کی تن دہی کا شکریہ ادا کرنا ہے جنکی باقاعدگیوں کے بغیر رسالہ کا وقت پر تیار ہونا اور آپ تک پہنچ جانا ناممکن تھا۔ اسکے بعد اُن لکھنے والوں کا احسان ماننا ہے جنہوں نے اُسکے جسمِ خاکی میں ادب کی رُوح پھُونک کر اس قابل بنایا کہ وہ علمی مجلس میں کہیں ایک جگہ پالے۔ بے انصافی ہوگی اگر ایسے لوگوں کا خاص طور پر ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے سال کے دوران میں کئی دفعہ اپنے خیالات سے ہمایوں کو مستفید فرمایا:۔

جناب کرنل بھولا ناتھ۔ پنڈت شو نرائن شمیم۔ سید ابو محمد ثاقب کانپوری۔ میرے فلک پیما دوست جو کبھی اپنا نام چھپاتے اور کبھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ جنابِ خلیقی جنہوں نے تصویروں کے متعلق اپنے خیالات ظاہر فرما کر خاص طور پر میری مدد کی۔ میرے عزیز میاں عطاء الرحمٰن جن کی چھُپی چھُپائی فسانہ نگاری پہلی دفعہ ہمایوں میں نظروں کے سامنے آئی۔ عبدالحی صاحب صدیقی۔ ضیاء الدین صاحب شمسی۔ اہل سخن میں گرامی۔ امین حزیں۔ محروم۔ سلیم۔ اثر صہبائی۔ برق دہلوی۔ ان حضرات نے ہمایوں کی زندگی کو برقرار رکھنے میں خاص حصہ لیا۔ تصویروں کے تیار کرنے میں میرے عزیز میاں عبدالجلیل اور میاں محمد اسلم نے بھی مدد دی جس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں۔

نئے ارادے

ہمایوں کے اصول کار کے متعلق میرے خیالات میں کسی قدر تبدیلی واقع ہوئی ہے جس کا اظہار اس لئے بھی

ضروری ہے کہ پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کی مدد کے بغیر اُس تبدیلی کا عملی صورت اختیار کرنا اگر ناممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے۔ میں نے پچھلے سال کے شروع میں عرض کیا تھا کہ "ہمایوں کسی خاص شعبۂ علم و ادب کے ساتھ وابستہ" نہیں بلکہ اُسے ایک ایسا گلدستہ بنانا منظور ہے" جس میں رنگ رنگ کے پھول اور طرح طرح کی خوشبوئیں" ہوں۔ اب بھی یہی خیال ہے کہ ہمایوں کو کسی خاص شعبے سے تعلق نہ ہو بلکہ اُسکے دامن میں قسم قسم کے پھول ہوں البتہ پھول زیادہ تر وہی ہوں جنکی خوشبو روح و دل کو سچی خوشیوں سے دوچار کرے۔ یہ ہمارا نصب العین ہے اس کا پُورا کرنا اور پالینا آپ سب کی مدد کے بغیر مشکل ہے اور غنیمت ہے اگر اس کے ساتھ بھی تھوڑا بہت حاصل ہو جائے۔

ہمایوں ایک خالص علمی رسالہ نہیں جیساکہ معارف ہے۔ یہ ادق لیکن مفید کام جن صاحبوں نے اپنے ذمے لیا ہے انہیں کا حصہ ہے۔ اس کے کرنیکی قابلیت نہ ہم میں تھی نہ ہے۔ اور نہ ہمایوں اُردو علم ادب کے لئے وقف ہے جیساکہ انجمن ترقیٔ اُردو کا سہ ماہی رسالہ اُردو۔ یہ کام بھی ہمارے بس کا نہیں۔ انکے علاوہ بعض اَور اُردو کے رسالوں کے کارکنوں کی قابلیت کا بھی ہم اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے اُردو ادب کو بہت سے ایسے خیالات سے مالامال کیا جن سے ہمایوں بھی فائدہ اُٹھاتا ہے۔ لیکن سوائے شاید ایک دو کے جن میں ہمایوں شامل نہیں کسی نے عملی طور پر زبانِ اُردو کو سیدھے راہ پر لانے کی تحریک شروع نہیں کی اور اس میں شک نہیں کہ اس بات کی ضرورت اور اہمیت کے صحیح احساس پر ہماری زبان کا دار و مدار ہے۔

عام طور پر اُردو کے رسالوں کی زبان بہت ادق ہے۔ اُردو والوں میں اکثر عربی فارسی لفظوں کی بہتات ہے جیساکہ ہندی والوں میں سنسکرت کے لفظوں کی بوچھاڑ ہے۔ ہندی والے اگر صرف ہندوستان ہی کی قدیم زبانوں سے اپنے لفظوں کا ذخیرہ تیار کرنا چاہیں تو اُنہیں کرنے دیجئے اگر وہ غلطی پر ہیں تو رہیں ہم اُن کو بُہت کہہ چکے اب بجائے خود غلط راہ پر چلنے کے یہ کیوں نہ کریں کہ آپ سیدھے رستے پر چلنے لگیں۔ اردو کیا ہے؟ ہندو مسلمانوں کے بولنے کی زبان۔ سو اس میں دونوں قوموں کی زبانوں کے الفاظ ہونے چاہئیں۔ عام زبان میں جو اصطلاحی نہ ہو اگر ہمیں عام فہم لفظ ملیں تو ہم کس لئے مولویانہ اور پنڈتانہ فقرے استعمال کریں۔ ہم قارئین کیوں کہیں پاٹھک کیوں کہیں پڑھنے والے کیوں نہ کہیں؟ ریاض کیوں کہیں اُدیان کیوں کہیں باغ اور پھلواڑی کیوں نہ کہیں۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ "شکیل" لفظوں کو کبھی کبھی لکھا کریں اور اکثر یہ کوشش کریں کہ اگر وہی مطلب سادہ زبان میں ادا ہو جائے تو مشکل طریق سے ادا نہ کریں۔ مثلاً سیدھے رستے کی بجائے کبھی کبھی راہِ راست لکھ لیا جائے تو خیر گناہ نہیں لیکن صراطِ مستقیم جائز ہو تو پھر سرل مارگ پر ناک بھوں

کیوں چڑھائی جائے۔ مذہبی کتابوں میں یا کسی خاص ضرورت کے باعث آپ صراطِ مستقیم یا سرل مارگ بھی کہہ لیں لیکن اگر ہمیں کہنا ہو کہ تو سیدھے رستے چل تو کیا ضرور ہے کہ یہی کہیں تو صراطِ مستقیم پر چل۔ اور اگر یہی ضد ہے اسی میں لطف آتا ہے کہ بڑے بڑے دماغ شکن لفظ بولے یا لکھے جائیں تو پھر ٹھنڈی سڑک کو بھی صراطِ منجمد کہئے آنکھ کو بھی عین یا نین ہی کہہ کیجئے لیکن ایسا کرنا تکلف یا بناوٹ میں داخل ہوگا قدرتی بات نہ ہوگی اس سے بولچال میں میل جول میں قوم قوم میں آدمی آدمی میں خواہ مخواہ کی رکاوٹیں پیدا ہو جائینگی۔ جن کے ہوتے ہوئے دلوں کا ملنا مشکل اور آہستہ آہستہ ناممکن سا ہو جائیگا۔

ان خیالات پر ہمایوں میں اتنا عمل نہیں کیا گیا جس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ پہلے خیالات اور تھے اور خیال یہ تھا کہ یہ باتیں قابل عمل نہیں اب عمل کرنیکا ارادہ ہے لیکن یہ احساس بھی ہے کہ اس کی قابلیت موجود نہیں کیونکہ گو یہ کام ظاہرا طور پر آسان ہے لیکن اصل میں اس کے اچھی طرح نبھانے میں بہت سی مشکلیں ہیں! بہرحال کوشش رہیگی کہ عمل ہو۔ اپنی نسبت یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ابھی لکھنے والوں کی آخری صف میں ہوں اور ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ جو ارادے کبھی کبھی جی میں پیدا ہوتے ہیں انکو پورا کرنیکی طاقت مجھ میں نہیں پھر بھی کچھ نہ کرنے سے تھوڑا سا کر سکنا ہی غنیمت ہے اور کہنا اس لئے ضروری ہے کہ شاید وہ لوگ اس طرف توجہ کریں جو اسکے اہل ہیں۔ ہمایوں کی پکار ہے میں غلط راہ پر ہوں اور کچھ اور بھی ہیں سیدھے رستے چل کر مجھے بھی سیدھا رستہ دکھاؤ۔ شکر ہے آزاد مرحوم کے وقت سے لیکر آجتک چند ایسے لکھنے والے پیدا ہوئے جنہوں نے تکلف کو سادگی کا سبق پڑھایا اب کوئی توجہ نہ دے یا بھول جائے تو انکا کیا قصور؟ ایسے ہی سچے عالموں اور مصنفوں کی ہمیں ضرورت ہے جتنے بھی ہوں کم ہیں، اردو کی ہر دلعزیزی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔ کہ مشکل پسند وا میں سخت مشکل میں ہوں اپنی پسند کو بدلو کہ میری مشکل آسان ہو اور لوگ پھر مجھے پسند کریں۔ اس عمل پسند کام کرنے والے زمانے میں بھی اگر ہم محض نام کے شیدا رہیں اگر ہم اپنے علم ادب میں بجائے روح معنی کے زبان کے چٹخارے کی جستجو میں ہیں تو حیف ہے ہماری ترقی کی خواہش پر اور ہمارے تمدن کی دعویداری پر لفظوں میں جبتک معنی کا نور اور معنی میں اصلیت کا جوہر نہ ہوگا ان لفظوں کا بولنا یا لکھنا نہ صرف غلطی ہوگی بلکہ ایک گناہ جو بات قدرت کے موافق ہو وہ کہو جو قدرت کے مطابق ہو وہ کرو ایسا کہنے کرنے ہی سے سننے اور دیکھنے والوں پر وہ اثر ہوتا ہے جس سے قومیں جیتی جاگتی ہیں۔

پھنسے ہوئے ہیں لیکن اب عام طور پر بمقابلہ نثر کے نظم میں عملی طور پر بھی حضرت داغ کی اس بات کو مانا جاتا ہے کہ

کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

(ہندی والے اس شعر کو پڑھتے وقت بجائے فارسی کے سنسکرت کا لفظ پڑھیں تاکہ غلط فہمی نہ ہو!)

یہ تو زبان اور لفظوں کا ذکر تھا اب مضمون اور معنی کے متعلق گذارش ہے کہ ہمایوں کے نزدیک اکثر وہ مضامین زیادہ قابلِ قبول سمجھے جائینگے جو نری علمیت یا ادبیت کے بجائے ایسے خیالات سے مالا مال ہوں جو ہمارے ناظرین کے لئے اخلاقی یا رُوحانی طور پر مفید ثابت ہو سکیں۔ اس سے یہ مُراد نہیں کہ ہمارے اہلِ قلم علم یا غرور یا مردانگی پر ایک "جواب مضمون" لکھیں تو ہم زیادہ مطمئن ہونگے یا عالمِ برزخ اور عالمِ لاہوت کی گتھیاں سُلجھائیں تب ہی ہم انہیں عارف و ہادی مانینگے بلکہ مُدعا یہ ہے کہ مضمون خواہ ادبی ہو یا علمی تاریخی ہو یا معاشرتی واقع ہو یا افسانہ لیکن اپنے اندر حقیقت کی جھلک رکھتا ہو اصلیت کی چاشنی دے اُسے پڑھ کر پڑھنے والے کے دل میں اچھے خیال پیدا ہوں دلیری مردانگی خودداری عفو انکسار قُربانی صبر و اُمید یہ جذبات اُٹھیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایسے خیالات کو ہمایوں کے دامن میں جگہ دیں جو دل سے پیدا ہو کر دلوں میں جگہ پائیں۔ مثلاً بتائیے کہ کیونکر آپ نے اپنی ٹیڑھی زندگی کو راست بنا لیا ہے جو دُنیا سے آپ نے سیکھا ہے جس شے نے آپکے دل میں انقلاب پیدا کر کے آپکو اور کا اور بنا دیا ہے اُسے اَوروں کے سامنے پیش کیجئے اور ہمجنسوں کا شکریہ لیجئے۔ اسکے برعکس اگر بعض باتوں نے آپکے نفس کو تھکا دیا ہے آپکے دل میں رنج لانیوالی خوشیاں بھر دی ہیں آپکے دماغ کو تکبّر کی راہ پر لگا دیا ہے تو بہتر ہے کہ اگر آپ اُن باتوں کو بُھول نہیں سکتے تو کم از کم اَوروں کو وہ تحفہ نہ دیجئے جسکی آرائش نے آپکے گھر بار کو اصلیت سے غافل کر رکھا ہے۔

ہمارے پاس ایسے مضامین کی کمی ہے اور جبتک لکھنے والے نہ لکھینگے کمی رہیگی ہم نے گدائی کا ہاتھ پھیلایا ہے۔ دینے والے آپ ہیں۔ ہم جو لینگے آپکے بھائیوں کے سامنے پیش کر دینگے۔ لکھنے والا کوئی ہو لیکن بات اچھی لکھی ہو۔ زبان سادہ ہو اور شیریں دلکش انگریزی علمِ ادب میں اخلاقی کتابوں کی کثرت ہے۔ وہاں سے بھی گلچینی کیجئے اور مشرق کو مغرب کی سادہ پسندی کا نمونہ دکھائیے۔ ہم ممنون ہونگے اگر اہلِ قلم اس کڑی منزل میں ہماری مدد کریں اور ہمیں گاہے گاہے اپنے مشورے سے فائدہ پہنچاتے رہیں۔ جیساکہ ہمارے ناظرین ملاحظہ فرمائینگے ہم نے ہمایوں کی ترتیب میں کچھ تبدیلی کر دی ہے۔ نثر و نظم کو اور رسالوں کی طرح ملا دیا ہے الگ الگ نہیں رکھا نظم میں کسی قدر زیادہ انتخاب کرنیکا خیال ہے۔ نیز اہلِ قلم کو واضح ہو کہ آئندہ مضامین کا آگے پیچھے شائع ہونا کسی طرح اُنکے بہتر یا کمتر خیال کئے جانیکا نتیجہ نہ سمجھا جائے۔ ہمیں صرف اس بات کا لحاظ رہیگا کہ مضمون کی ترتیب ایسی ہو کہ پڑھنے والا اُن سے زیادہ لُطف اُٹھا سکے!

بشیر احمد

جہاں نُما

دُنیا ترقی پر ہے! "تمدن" اپنے تکبّر کو محسوس کرتا ہے اور عیش و عشرت سے کہتا ہے بہتر ہے کہ ہم ناداروں کو اور نہ پیسیں۔ اُدھر ناداروں میں خودداری پیدا ہو رہی ہے جو اُٹھ اُٹھ کر پکارتی ہے "میں وہ نہیں جو تمہارے گرانے سے گروں تو گری رہوں، میں اُٹھی ہوں تو جب تک کچھ نہ کر لوں بیٹھونگی نہیں!" قدرت فطرت کے اس دنگل کا تماشا کر رہی ہے اور کہتی ہے "جو جس کا حق ہے لے، جو کسی کا حق نہیں وہ آپ چھوڑ دے اور اُس پر کوئی ہاتھ نہ بڑھائے میں خود جسے قابل سمجھونگی دونگی"، خلقِ خدا کچھ سُنتی ہے کچھ نہیں سنتی جب سُنتی ہے تو دنوں میں صدیوں کی مسافت طے کر لیتی ہے جب نہیں سنتی تو ہفتوں میں ہزاروں سال پیچھے کو جا پڑتی ہے! یہ ہے دُنیا اور اُسکی زندگی!!

ہندوستانِ حکومت آباد میں ایک خاموش انقلاب تیزی کے ساتھ آ رہا ہے۔ اب رُوٹھنے کا زمانہ ہو چکا، سرکار اور رعایا کے باہمی تعلقات کی تلخی میں کچھ شیرینی پیدا ہونے لگی ہے اور دونوں سمجھتے ہیں کہ صرف دوسرے کی نہیں بلکہ آپ بھی! اپنی ترش مزاجی کا علاج کرنا پڑیگا۔ سیاسی اکھاڑے میں پہلوان جو ایک دوسرے سے رُوٹھ کر الگ الگ ہو گئے تھے پھر مُسکراتے ہوئے آپس میں گتھم گتھا ہونیکو ہیں۔ اُنکے ہمراہی کبھی کبھی کڑوی باتیں کرتے ہیں لیکن وہ خود مُسکراتے ہی ہیں اور ایکدوسرے کی فراخدلی کو مانتے ہُوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے کیا ہو؟ ایک بات یقینی ہے کہ اب اہلِ مُلک اپنے نمائندوں کے چُننے میں زیادہ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہیں۔ ہمارا وطن مشکلوں میں پڑ پڑ کر زیادہ مضبوط ہوتا دکھائی دیتا ہے!

اسلامی دُنیا نہ صرف جاگ اُٹھی ہے کہ اُسے جاگے تو اک مدت ہو گئی بلکہ اُٹھ کر قدم بڑھانے لگی ہے سلطنتِ تُرکی کے مردوں نے یورپ کے گھر میں جا کر اپنا لوہا منوالیا اور برابری کا درجہ حاصل کیا۔ اُدھر اُن کی عورتوں نے اپنے گھر میں آزادی کی دُھوم مچا رکھی ہے کہ بندش کے دن گئے اور رہائی کا زمانہ آیا! افغانستان کی جہالت کے اندھیرے میں تعلیم کے ہزاروں دیئے روشن ہو رہے ہیں۔ اگر خدا نے چاہا تو یہ بے ساحل ملک ایک دن ایشیا کا سوئٹزرلینڈ بن جائیگا! عرب جسے اُسکے مغربی محسنوں نے اُسکے تُرکی حاکموں سے چھڑایا تھا اب اپنے اِن محسنوں کے پنجے سے بھی چھوٹ جانیکو ہے بلکہ چھوٹ چُکا ہے! شمالی افریقہ کی محکوم قومیں بھی صاف بتا رہی ہیں کہ ہم جنکے سائے تلے برسوں رہے ہیں اُن مہذب درختوں کی پت جھڑ کے دن آ گئے ہیں! صرف

ایران اور ہندی مسلمان باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام کم لیکن یہاں بھی ایک سست سی بے چینی کروٹیں لے رہی ہے اور اپنے ہم مذہبوں کو خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھکر یہ لوگ چند ہی ماہ ہوئے کہ کہہ اُٹھے سے

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

مُسلمان نہ صرف زور و شور میں بلکہ تعداد میں بھی بڑھ رہے ہیں چنانچہ ذویمر پادری کے خیال کے مطابق اس وقت دنیا میں تقریباً اکتیس کروڑ ۲۲ لاکھ مسلمان ہیں ان میں سے دو لاکھ سے زیادہ امریکہ میں پونے دو کروڑ یورپ میں چھ کروڑ کے قریب افریقہ میں سات کروڑ ہندوستان میں ایک کروڑ سے کچھ کم چین میں اور ایسے ہی کچھ کچھ اور مُلکوں میں آباد ہیں تعداد پر بھول نہ جانا کہ سوائے یورپ کے پڑھے ہوئے مُسلمانوں کی اوسط کسی ملک میں ۲ فیصدی سے زیادہ نہیں اور ہندوستان جنت نشان میں تو صرف پونے چار فیصدی کے قریب ہے سو غرور کرنے کی ابھی تک زیادہ گنجایش نہیں!

انگلستان میں مزدوروں کی جماعت زوروں پر ہے اور عورتوں کی قوت بھی بڑھ رہی ہے دو کروڑ رائے دہندگان میں سے نوے لاکھ عورتیں ہیں کیا اب بھی صنفِ نازک کو ہم برابر کا نہ مانیں گے؟ حکومتِ برطانیہ روز بروز محسوس کر رہی ہے کہ قوموں کی مجلس میں اب مجھے زیادہ نرمی برتنی پڑیگی شہنشاہی رعب داب کو اب خود ہی کم کر دینا اچھا ہے! فرانس مظلوم کہلا کر ظالم بن رہا ہے کیا عجب ہے کہ ظلم کی شدت سے بھائی بندی کا سبق سیکھ لے!

اطالیہ جو موقع پا کر اپنے پڑوسیوں پر حملہ کیا چاہتا تھا سمجھتا ہے کہ اب دُنیا کا رنگ اور ہے اور تیار ہے کہ رُوس سے باقاعدہ تعلق پیدا کر لے رُوس قدرے خاموش ہے شاید بجائے دنیا میں شور مچانے کے اپنے گھر کی دیکھ بھال کر کے اسے دوسروں کی مہمانی کیلئے آراستہ کر رہا ہو؟ بلقان کی ریاستیں یونان کی شکست کو دیکھ کر دم بخود ہیں اور ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتی ہیں کہ اچھا ہوا ایک ہی پٹا۔ ہمارے پاس تو جو ہے وہی بہت ہے!

آسٹریا یا ہنگری کا تو نام بھی کم ہی سُننے میں آتا ہے سو وہاں خیریت ہوگی البتہ ہسپانیہ غیر معمولی طور پر بے چین ہوا لیکن پھر اپنی سی چُپ سادھ لی!

آئرستان اب بالکل خاموش ہے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً غلامی کی ہزاروں راتیں جاگ کر اب آزادی کے دن میں سو رہا ہے!

امریکہ سب سے الگ تھلگ کسی ہوشیار بنئے کی طرح اپنا ہی کھاتہ کھولے بیٹھا ہے اور بڑے بڑے ساہوکاروں سے کہتا ہے بھئی کب کا وعدہ تھا اور کتنی مدت ہوگئی؟ میرے بال بچے کھلونے مانگتے ہیں کوئی روپیہ پیسہ نکالو۔ خدا اس بنئے کو زندہ رکھے کہ یہ سادھو بھی ہے اور کسی دن دُنیا کو پریم کا گیت سُنا کر اپنا بنا لیگا!

ب

نپولین

("میں چٹان کا ایک ٹکڑا ہوں جسے فضا میں پھینکا گیا")

یہ ہے دُنیا کا "سب سے بڑا آدمی!" اور جیسا کہ انگریزی شاعر بائرن کہتا ہے "سب سے بُرا بھی نہیں"!

اٹھارھویں صدی کے اخیر میں ننھے جزیرے کارسیکا کے اس سپوت نے فرانس کو اپنا وطن بنایا اور اُس حال میں کہ یہاں ایک ہلڑ مچا ہوا تھا۔ حریت اور آزادی کی پوجا کرنیوالوں پر یورپ بھر کے ظالم و جابر حکمران جھپٹے پڑتے تھے اس نے ہمت و شجاعت کی تلوار سے اُن پر مشرق، مغرب میں شمال، جنوب میں حملے پر حملہ کیا اور انکی جمعیت کو بکھیر دیا۔ فرانسادی قوم نے [illegible] شہنشاہ! جیتے رہو کے نعرے بلند کئے۔ وہ سپاہی جو کماندار سے سپہ سالار بنا تھا سپہ سالار سے قونصل اور قونصل سے شاہنشاہ ہو گیا۔ اب اسکا دماغ آسمان پر تھا بلکہ اس سے بھی اونچا۔ اس نے غرور میں آکر کہا "قسمت ایک عورت ہے اور جتنا وہ میرے لئے کرچکی اتنا ہی اور میں اسکے سر چڑھونگا" فرانس کی خوشحالی کو بھول کر وہ ذاتی شان و شوکت کے پیچھے دوڑنے لگا۔ بغیر سوچے سمجھے فرانس بھی اسکے پیچھے ہو لیا اور دونوں جبر و قوت کی چوٹیوں پر بہتے ہوئے ذلت کے غار میں اوندھے منہ گرے۔ نپولین نے کہا "لوگ پوچھنا چاہیں گے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہم یورپ کو ملیامیٹ کرنیکو ہیں۔ پھر ہم لٹیروں کی طرح اُن لٹیروں پر جا پڑینگے جو ہم سے کم منچلے ہیں اور ہم ہندوستان کے حاکم بن جائینگے!" لیکن یورپ کی قوموں کو ملیامیٹ کرنا نپولین سے بھی نہ ہوسکا قومی روح کو تباہ کرنیکی کوشش سے صرف یہی ہوا کہ قومی جوش ملک ملک میں بھڑک اُٹھا اور چاروں طرف انگلستان میں، سپین میں، روس میں، جرمنی میں آزادی کی آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ نپولین کو شکست ہوئی وہ بھاگ نکلا پکڑا گیا اور جزیرہ ایلبا میں قید کر دیا گیا۔ وہاں سے آنکھ بچا کے نکلا اور فرانس میں قدم دھرتے ہی پھر لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ بلجیم کی طرف بڑھا اور اتحادیوں پر جا پڑا۔ واٹرلو کے میدان پر رضائے الٰہی نے کہا اب تو میرے نیچے سے نہیں نکلیگا۔ بھاگا اور ہمت و استقلال کا پتلا بن کر چاہا کہ پھر فرانس کو اکسائے۔ یہاں خدا نے سب کے دل پھیر دیئے تھے سب نے ٹکا سا جواب دیا کہ وہ دن ہو چکے مجبور ہو کر تخت و تاج کو چھوڑا اور ساحل کی طرف منہ موڑا۔ وہاں انگلستان کے جہاز آؤ بھگت کیلئے تیار کھڑے تھے چنانچہ خود ہی ۱۵؍جولائی ۱۸۱۵ء کو بغیر شرط لئے یا دیئے اپنے تئیں بلیروفن جہاز کے کپتان میٹ لینڈ کے سپرد کر دیا +

یہ جلاوطنی کا پہلا اور وطن کے درشن کا آخری دن ہے! اے دُنیا کے سب سے عقلمند سپہ سالار! اے سب کو قید کرنیوالے اپنے قیدی! جا بحرِ اوقیانوس کے ایک کونے میں جزیرہ سینٹ ہیلینا کی کسی خاموش وادی میں قدرت تیرا انتظار کر رہی ہے!!

د۔ ب۔

خیالاتِ ہمایوں

والدِ بزرگوار مرحوم کا علمی ادبی خزانہ میری غفلت کے باعث برسوں سے ان دیکھا پڑا ہے۔ اب ارادہ ہے کہ اُسے کچھ عرصے کے بعد شائع کیا جائے اور اس سے پہلے اسکے کچھ حصے ہمایوں میں ناظرین کی نذر ہوتے ہیں + ذیل کا ٹکڑا انکے ایک مضمون سے جو جنوری ۱۸۸۲ء میں اخبار رہبر ہند لاہور میں شائع ہوا لیا گیا ہے۔ اس وقت انکی عمر چودہ برس کی تھی + میاں صاحب مغفور کے دوستوں سے درخواست ہے کہ اگر انکو میاں صاحب کے متعلق کوئی واقعہ یا خاص بات معلوم ہو تو وہ براہِ مہربانی مجھے اطلاع دیکر ممنون فرمائیں۔ تحریر یا ہمایوں میں شائع کر دی جائیگی یا سیرتِ ہمایوں کے لئے محفوظ رکھی جائیگی +

اٹھو۔ اٹھو۔ اے میرے ہموطنو! کس نیند سوتے ہو؟ دیکھنا دیکھنا! اُدھر مغرب کی طرف جہانتک نظر کام کرتی ہے کیسی برق کی سی روشنی دکھائی دیتی ہے کہ آنکھ سامنا نہیں کر سکتی۔ ادھر مشرق کی طرف بھی آنکھ پھیرنا۔ ہاں وہ سامنے کچھ دھیمی دھیمی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ بھاگنا۔ بھاگنا۔ کہ شمال کی طرف سے ایک گرد بادِ آتشیں چڑھا چلا آتا ہے۔ خیر گذشت کہ وہیں جل جلا کر رہ گیا۔ دیکھنا! ہمالیہ سے پرے پرے کیسی شبِ ماہتاب ہے۔ لے لو! ادھر شبستانِ چین کا چراغ بھی ٹمٹمانے لگا۔ اس سے آگے پانی کی اس جانب نظر ڈالنا۔ اہا ہا! وہ تو ایک آتشیں غبارہ اُس سرزمین سے اُٹھا۔ دیکھنا! دیکھنا! آسمان کا تارا ٹوٹا جاتا ہے۔ کیا وہاں آتشبازی ہو رہی ہے؟ نہیں نہیں! یہ سارے تہذیب کے پٹاخے ہیں۔ بھئی سچ پوچھو تو انکی شوخ رنگی کے آگے مغرب والوں کا رنگ پھیکا ہے۔ قبلہ! سب کچھ دیکھا۔ ساری دُنیا نئے نئے رنگوں میں چمکتی ہے مگر نہ معلوم یہ کونسا تاریک خطہ ہے جہاں کہیں کہیں برق کی سی اُبھرتی روشنی نظروں میں کوندی جاتی ہے بھئی کیا پوچھتے ہو یہ ہم غریب الدیاروں کا ٹوٹا پھوٹا وطن مالوف ہندوستان ہے وائے نصیب کہ ہم وطن ہیں تو شبِ تاریک کے بجھے چراغ جن پر آسمان کے تارے تک چشمک زنی کر رہے ہیں۔ الٰہی کب وہ دن ہوگا کہ شاہانِ سکندر حشمت اور پیر مردانِ خضر صفت کی زبان پر ہوگا کہ ہاں آبحیات ہے تو ظلمات میں اور تہذیب ہے تو ہند میں + آمین ثم آمین

"جاتا ہے وقت" ہے یہ جرس کی پکار آج
ہے کوئی کارواں میں اگر ہوشیار آج

تاریخ امثال

زبان کی ٹکسال میں ضرب الامثال کا سکہ جتنا پرانا ہوجاتا ہے اُسی قدر اُس کا چلن زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کہاوت شاعروں کے تغزل کی طرح کسی تازہ فکر سخن کا نام نہیں ہے۔ بلکہ صدیوں پہلے بے ساختہ اُسکی آمد ہوتی ہے اور قرنوں کے بعد مجمع اخص سے خاص، خاص سے عام، اور عام سے عوام تک کے روزمرہ میں گھُل مِل کر یہ آور دعجیب وغریب رنگ آمیزیاں پیدا کرتی ہے،

مثل عربی زبان کا لفظ ہے جس کو ضرب المثل بھی کہتے ہیں اور فارسی میں بھی یہی اعلام مشہور ہیں۔ دوسرا مترادف لفظ متداول کتابوں میں مروج نہیں۔ ہندی بھاشا اور اُردو میں کہاوت۔ بچن۔ بول سے یہ مفہوم ادا ہوتا ہے۔ مگر پڑھے لکھے اُردو میں بھی اکثر مثل ہی کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مشہور اور مختصر کلام ہوتا ہے جس کو عام خاص سب کی زبانوں پر جاری دیکھا جاتا ہے اور کوئی نہ کوئی قصہ ضرور اُس سے متعلق ہوتا ہے۔ ایک فلسفی کا بیان ہے کہ "مثل ایک ایسا کلام ہے جو اپنی اصل سے قطع (مختصر) کیا گیا ہو" دوسرا ماہر زبان کہتا ہے کہ "مثل وہ مختصر کلمات ہیں جن میں متقدمین نے اپنی زندگی کا خلاصہ سمیٹ کر رکھدیا ہو" تیسرا قول ہے کہ "مثل وہ ہے جو طویل تجربے سے مختصر کلام بنایا گیا ہو"

کہاوت یا مثل کی ایک آسان پہچان یہ ہے کہ وہ سلسلۂ کلام میں جس واقعے کے ساتھ بولی جائے۔ اُس سے بالکل چسپاں ہو۔ مثلاً "ہنوز دہلی دوراست" یہ جملہ خواہ حضرت نظام الدین اولیا کا ارشاد ہو یا شاہ نعمت اللہ ولی کی زبان سے جہانگیر کے عہد میں نکلا ہو، مگر ایسا نکلا کہ شہرت کے پروں سے اُڑتا اُڑتا ہر جگہ پہنچ گیا۔ جب کوئی واقعہ ایسا بیان کیا جائیگا جس کے ہونے نہ ہونے میں توقف نظر آتا ہو اُس جگہ یہ جملہ بطور تمثیل بولا جاسکتا ہے

جس طرح فنِ بلاغت میں تلمیح وہ صنعت ہے جس میں ایک دو لفظوں کے استعمال سے پورا واقعہ واقفین کے ذہن نشین ہوجاتا ہے اُسی طرح مثل کے استعاروں سے چُنے ہُوئے دامن کو بلحاظ واقعہ ایک بڑا امیدانِ معنی سمجھنا چاہیئے۔ یا بالفاظ دیگر اس زمانے کے مذاق پر مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کی ایک قسم جاننا چاہیئے۔ ان مناسبتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ تلمیح و مختصر نویسی میں خواص کی طرح عوام کو دلچسپی نہیں ہوتی اور مثل عام وخاص سب کی زبان زد ہوتی ہے۔

مثل کب بنی یا بنائی گئی - اس کی تحقیق امکانِ تاریخ سے باہر ہے۔ کیونکہ ابتدائے آفرینش سے مدتِ مدید تک انسان اس قابل نہیں ہوسکا کہ وہ اپنی تمام ضرورتوں اور تفریحوں کے سامانوں کو فراہم کرسکتا۔ اور جب تک وہ صحیح معنوں میں متمدن کہے جانے کے قابل نہیں ہوا اسکی تمام باتوں کا جمع خرچ زبانی رہا۔ ایسی حالت میں وہ نسلیں جو دو چار صدیوں نہیں بلکہ ہزاروں صدیوں کے بعد متمدن ہوئیں اور اپنی ضروریات کے لئے رفتہ رفتہ علوم و فنون اور طریقۂ نوشت و خواند کو ایجاد کرتی رہیں وہ واقعات کہاں قلمبند پاسکتی تھیں جو اُن سے جگوں پہلے صرف سینے کے سفینوں میں تھے۔ اور اب زمینوں کے دفینوں میں بھی نہیں ملتے۔ باایں ہمہ قیاسات و قرائن یہ بتاتے ہیں کہ کوئی زمانہ اور کوئی قوم ایسی نہیں ہوئی جس میں کہاوتیں یا مثلیں انسانوں کی۔ بانوں پر جاری نہ رہی ہوں ؀

مثلوں کا ایجاد تعلیم و تعلّم یا فکر و غور سے نہیں ہوتا۔ کوئی قابل سا قابل دماغ اگر چاہے کہ میں راتوں کی بڑی سی بڑی تنہائی میں کسی مضمون یا شعر کی طرح کسی واقعے کے متعلق کوئی مثل بنا لونگا تو یہ خیال اُس کا ایک رات کیا بے شمار راتوں کی لگاتار محنت و دماغ سوزی پر بھی پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ ایجاد ہے جو وجودِ انسان کے ساتھ واقعات کی ترتیب سے بغیر فکر و غور فطری بے ساختگی کو لئے ہوئے ظہور پذیر ہوتا ہے یہ بات ماننے کے قابل ہے کہ جبتک کتابوں کا نام و نشان نہ تھا۔ کتابت و حفاظت کے طریقے نہیں بنائے گئے تھے اور جب کہ مدتہائے مدید تک کتابی درایت کا زبانی روایت پر انحصار رہا۔ اُس وقت بھی کم و بیش کہاوتوں کا وجود ضرور تھا۔ انسان کے حالات میں خواہ کتنے ہی اور کیسے ہی تغیرات ہوئے ہوں۔ مگر حوادث و واقعات جو اُس پر پہلے زمانے میں گذر چکے ہیں وہی اب بھی گذرتے ہیں۔ اور گزرتے رہینگے۔ جن اصول کو قدرت نے کارفرمائی کے لئے قدیم زمانے میں مقرر کیا تھا اُسی طرح کے صول اب بھی اپنا عمل کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ زمانۂ حاضرہ میں اُنکے نام بدل جائیں مگر وہ کام نہیں بدل سکتے۔ سچی باتیں ساری دُنیا میں ایک ہی سی چلی آتی ہیں اور یونہی چلی جائینگی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مثلوں میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ جو کہاوتیں اگلے زمانوں میں اَن پڑھ جاہلوں کے دستور العمل میں شامل تھیں وہی اب حکماء اور تمام مدبّروں کیلئے انسانی زندگی کا نہایت دلچسپ دبستان بنی ہوئی ہیں ؀

کہاوتوں کے بنائے جانیکا سب سے پہلا زمانہ متعین کرنا دشوار و محال ہے۔ ارتقائی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ مان لینا چاہیئے کہ انسان جب اپنی ضروریات کے لحاظ سے روزمرّہ کی زبان

کو اتنی وسعت دے لیتا ہے کہ اُس میں ہر قسم کے تمدنی، ملکی، معاشرتی، خانگی، مذہبی، خیالات کا اظہار کر سکے
اُس وقت مذاقِ طبعی کی امداد سے خاص خاص مواقع کے لئے ایسے اصول ایسے اشارے اور ایسی باتیں مخصوص کر لی
جاتی ہیں جن کا مفہوم بہ باطن کچھ اور ہوتا ہے اور بظاہر ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے۔ اس قسم کے ایجادوں
میں مثلوں اور کہاوتوں کا اختراع بھی قرینِ قیاس ہے۔

بڑا حکیم وہی ہوتا ہے جو انسانوں کے علم باطنی کا عالم ہو۔ اس لئے حکما نے ضرب المثلوں سے
انسان کے اندرونی حالات کی تفتیش میں کوشش کی ہے اور اُن سے عجیب عجیب تحقیقاتِ علمیہ کی ہیں
انہوں نے ضرب المثلوں سے وہ نتائج پیدا کئے ہیں جو تواریخ سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ ارسطو جس کو حکمت کا معلّمِ
اوّل مانا گیا ہے ضرب المثلوں کا بھی معلّمِ اوّل ہے۔

جیسا کہ مجملاً ابھی بیان کیا گیا کہ جب انسان اپنی تمام ضروریات کے لحاظ سے بعض واقعات کے ظاہر
کرنے یا چھپانے پر مجبور ہوتا ہے اُس وقت اُس کی ضرورتیں ایسے ایسے اختراع و ایجاد پر مجبور ہوتی ہیں
جن سے مختلف فائدے مترتب ہو سکیں۔ ایسے اختراعات کا ایک کھلا ہوا منشاء پرانے اور گزشتہ واقعات
کا زندہ رکھنا ہے۔ اگرچہ اُن کو گزرے ہوئے مدتِ مدید ہو جاتی ہے۔ نیز بظاہر وہ ایک معمولی لطیفۂ سخن
سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ زبانوں پر جاری رہتے ہیں اور دنیا میں انسان کے فطری معمولات
کارفرمائی کرتے رہتے ہیں، اس لئے اُس قسم کے واقعات پیش آنے پر ضرب الامثال کے فقرات یاد آجاتے
ہیں اور برمحل اپنے استعمال کو موزوں بناتے رہتے ہیں۔ جن سے نہ صرف موجودہ تمثیل کا لطفِ خاص حاصل
ہوتا ہے بلکہ پرانی تخیّل کی ایک تصویر سامنے آجاتی ہے۔

ابتداء سے ایسے مقولے کسی خاص موقع پر بے ساختہ واقعے کی مناسبت سے زبانوں پر آتے ہیں
مگر رفتہ رفتہ اُن مثلوں کے ذریعے سے گذشتہ اقوام کی معاشرت، طبیعت اور اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً
ایک شخص مرتے وقت اپنا سب مال و اسباب اپنے وارثوں میں تقسیم کرنے لگا۔ اتفاق سے اُس کی ایک گائے
کھو گئی تھی جس کے لئے اُس نے یہ وصیت کی کہ اگر وہ مل جائے تو میرے وارث لے لیں ورنہ خدا کے نام
پر دے دیں۔ اس واقعے سے یہ مثل بن گئی کہ جو کھویا گیا وہ خدا کے نام خیرات۔ اس ضرب المثل سے
انسان کے برے اخلاق کا پتہ چلتا ہے کہ ایسی گم شدہ شے کو اُس خدائے عز و جل کی نذر کیا جاتا ہے جس کے
لئے عزیز سے عزیز چیز بھی نہ رکھنی چاہیئے۔ بالکل یہی مطلب ہندی بھاشا کی کہاوت میں اس طرح

مشہور ہے "موئی بچھیا بامن کے نام"۔ اسی طرح سکندر اعظم جب ایرانیوں سے لڑنے گیا تو اس کے افسروں نے ایرانیوں کے بیشمار لشکر کا (خوف زدہ ہوکر) سکندر سے ذکر کیا۔ جس کو سن کر وہ بے ساختہ کہہ اٹھا۔ کہ "ایک قصائی بہت بھیڑوں سے نہیں ڈرتا"۔ اس برمحل فقرے کو یہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ خاص وعام کی زبانوں پر جاری ہوکر مثل بن گیا۔ غرض کہ

مثلوں کا فن

مضامین ادب کا عنوان ہے۔ عقل روشن کا خلاصہ ہے۔ خردمندوں کے بازوں کا تعویذ ہے بھٹکے ہوؤں کے لئے خضر راہ ہے۔ افسردہ دلوں اور غمزدوں کے لئے ایک شگفتہ چمن ہے جو انسانی زندگی کے بڑے حصے پر محیط ہے اور جس میں زندگی کی تمام نیرنگیاں دکھائی دیتی ہیں جس طرح کہ انسان مختلف واقعات، متضاد جذبات اور بے شمار کیفیات اور خیالات کی پوٹ ہے، اسی طرح مثلوں اور کہاوتوں کی بے تعداد قسمیں ہیں۔ ضرورتوں اور ضرورتوں کے ساتھ سلسلۂ ایجاد کی کوئی انتہا نہیں ہے زمین آسمان زیر و بالا، چپ و راست جس طرف جو چیز نظر آتی ہے وہ سب اسی ایک ضعیف البنیان انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے جب کہ کائنات کی یہ بہتات ہو۔ پھر ضرورت مندیوں کا کیا شمار ہو سکتا ہے۔ جینا، مرنا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، ملنا جلنا، پڑھنا لکھنا، تجارت زراعت، سیاست اطاعت، معاش، معاد، غرض کہ جس قدر مشغلے ہو سکتے ہیں اُن سب کی یادگار مثلوں اور کہاوتوں میں مل سکتی ہے۔ مثلاً

(۱)۔ بہ کثرت مثلیں ایسی ملیں گی جن کے سننے سے ایک دور میں انسان گزشتہ زمانے کے واقعات وعادات ارزانی وگرانی اور طرز ماند و بود وغیرہ معلوم کر سکتا ہے۔

(۲)۔ بعض مثلیں خاص ملک یا خاص قوم کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔

(۳)۔ بہت سی مثلیں شاعرانہ دربار میں استعارات وتشبیہات سے آراستہ نظر آئینگی۔

(۴)۔ کچھ مثلیں بالکل سادہ اور معمولی الفاظ میں ہونگی۔

(۵)۔ تھوڑی بہت کہاوتیں شعرا کی نظم کا کوئی جزو ہونگی۔ جو ابتداً یہ سمجھ کر منظوم نہیں ہوئیں کہ اُن کو مثل بننا ہے۔

(۶)۔ چند ضرب المثل دوسری زبانوں سے ترجمے کا جامہ پہن کر جلوہ گر نظر آئینگی۔

(۷)۔ سینکڑوں مثالیں وہ ہیں جن کا مضمون تمام قوموں کے لئے یکساں مطابقت کرتا ہے۔
واضح رہے کہ اتنی یا جتنی قسمیں مثلوں اور کہاوتوں کی ہوسکیں وہ سب موجودہ اور آئندہ نسلوں کے واسطے گزشتہ تاریخ کا سبق دیتی ہیں۔ جن سے زمانۂ ماضی کے واقعات و حالات اور تمام امکانی وارداتِ زندگانی کی چہرہ کشائی ہوتی رہتی ہے۔
مذکورہ بالا اقسام کی تشریح مثالاً سمجھ لینی چاہیئے کہ کن کن مثلوں میں کیا کیا باتیں پائی جاتی ہیں:۔
(الف) اَلدُّنیا جِیفَۃٌ وَّطَالِبُھَا کِلَابٌ (یعنی دنیا مردار ہے اور اُس کے طالب کُتے) یہ مثل مخصوص ملک عرب اور مُسلمانوں کے لئے ہے کہ وہ مذہباً کُتے کو ناپاک جان کر پالنا پسند نہیں کرتے، ایسے کُتے گلی کوچوں میں پڑے پھرتے ہیں اور مُردار کھاتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہاوت اُن مُلکوں کے لئے موزوں نہیں جہاں کُتے آدمیوں کے برابر عزیز ہیں اور اُنکو کبھی مردار کھانے کا موقع نہیں ملتا۔
یا "آب آمد تیمم برخاست"۔ اس مثل کو غیر مسلم ایجاد نہیں کرسکتا کیونکہ اسکو تیمم اور وضو کا فرق اور ضرورت معلوم نہیں۔ اِسی طرح انگلستان کی یہ کہاوت کہ "دھوپ نکلے تو اپنی گھاس سکھاؤ" اُن جنوبی مُلکوں کے لئے ایجاد نہیں ہوسکتی۔ جہاں ہمیشہ دھوپ نکلتی رہتی ہے۔
(ب)۔ ایسی مثلیں بہت زیادہ ملینگی جو پورب پچھم اُتر دکن ہر جگہ یکساں مفہوم رکھتی ہوں، بلحاظ مضمون ان کی سچائی فطرۃً سب کے نزدیک مسلّم ہے، مثلاً "سانچ کو آنچ نہیں" اس کہاوت سے کسی قوم، کسی ملک، کسی زبان کو اختلاف نہیں، کسی کی عقل و فراست اسکی سچائی سے انکار نہیں کرسکتی یہ ممکن ہے کہ ایسی مثلیں جنکو مفہوم عام کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا جائے، مختلف پیرائوں میں ادا کیجائیں، مگر نتیجہ سب کا ایک ہوگا۔ ذیل کے مختلف پیرائوں سے نتیجے کے یکساں ہونے کی صورتیں سمجھی جاسکتی ہیں،

(۱)۔ انگلستان کی مثل ہے۔ "اپنے اوپر شہد لگاؤ مکھیاں خود چمٹ جائینگی"
(۲)۔ ڈنمارک والے کہتے ہیں۔ "گدھے بن جاؤ ہر ایک کا بورا پیٹھ پر رکھا جائیگا"
(۳)۔ فرانسیسی مفہوم ہے۔ "جو اپنے کو بھیڑ بنائیگا۔ اُسکو بھیڑیا کھا جائیگا"
(۴)۔ ایرانی کہاوت ہے۔ "شکر نہ بنو نہیں تو ساری مکھیاں کھا جائینگی"

اِن مثالوں کو پڑھ کر معمولی غور سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ باوجود اختلاف الفاظ نتیجے میں ایک ہی مقصد ہے۔

(ج)۔ شاعرانہ انداز کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مدعا کو سیدھے سادے الفاظ کی جگہ مبالغہ، و تشبیہ، یا استعارہ و مجاز، اور موزوں و مقفّی، پیرائے میں ظاہر کیا جائے۔ یہ اندازِ بیان نہایت دلکش و دلچسپ ہوتا ہے اور دوسری قسموں کے مقابلے میں زیادہ مقبول پایا جاتا ہے۔ دیکھئے "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا" اس کا مفہوم یہ ہے کہ خود کام کرنیکا سلیقہ نہیں مگر بیکار تاویلوں سے اپنا عیب چھپایا جاتا ہے۔ اس مطلب کو ان شاعرانہ مبالغہ و استعارات میں ظاہر کیا گیا۔ کہ جب ناچنے والے پر اس کے ٹیڑھے بیڑھے پاؤں پڑنے پر اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ بجائے اعترافِ قصور یہ کہتا ہے، کہ میرے پاؤں ٹیڑھے نہیں پڑتے بلکہ آنگن (صحن) ہی ٹیڑھا ہے۔ مذاقِ سلیم اس ادائے مطلب پر جس قدر غور کریگا اسی قدر لطف اٹھا سکتا ہے ۔

(د)۔ سادہ اور معمولی الفاظ کی کہاوتیں بھی کافی تعداد میں موجود ہیں مثلاً "مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی"، یا "آپڑوسن مجھ سی ہو" ان کا مفہوم بہت صاف اور آسان ہے ۔

(ہ)۔ شعرا کے بکثرت اشعار ایسے ہوتے ہیں جو اپنی دلکشی اور سچائی کے سبب زبان زد ہوتے ہوتے ضرب المثل بن جاتے ہیں۔ اور پھر روزمرّہ کی گفتگو میں تمثیل کے طور پر بولے جاتے ہیں، مثلاً ع "دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد" یا "تکبر عزازیل را خوار کرد"۔ یا ؎ "یاں فکر معیشت ہے وہاں غدغۂ حشر
آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے"

(و)۔ عربی۔ انگریزی۔ فارسی۔ ہندی۔ اور دیگر مروجہ زبانوں میں اکثر مثلیں ایسی پائی جاتی ہیں جو اپنے تمام اثر کے لحاظ سے ترجمہ ہوتی رہتی ہیں۔ یہ مسلّم ہے کہ ترجمے سے وہ لطافت اور شگفتگی نہیں رہتی جو اصل زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر بھی بعض بعض کہاوتیں ایسی ملتی ہیں جن کے ترجمے میں بھی الفاظ و معنی کی وہی خوبیاں باقی رہتی ہیں جیسی اصل میں تھیں۔ مثلاً "مَنْ جَدَّ وَجَدَ" کا فارسی ترجمہ "جوئندہ یابندہ" گویا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کہ فارسی میں یہ ضرب المثل اصل ہے یا کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہے۔ ترجموں کی دقتیں اور لطافتِ معنوی کی مشکلیں انہیں مثلوں میں پائی جاتی ہیں جو از روئے مفہوم شاعرانہ اسلوب بیان رکھتی ہیں۔ سادہ اور معمولی الفاظ کے ترجموں میں یہ دقت نہیں جیسے "ہنوز دہلی دور است"، کی جگہ "ابھی دلی دور ہے"، کہنے میں کوئی اجنبیت نہیں معلوم ہوتی اور نہ لطافت و شگفتگی میں کوئی کمی ہوتی ہے ۔

(ز)۔ ایسی کہاوتیں جن سے گذشتہ زبانوں کے واقعات اور اخلاق و عادات ارزانی

گرانی وغیرہ کا پتہ چلتا ہو۔ ہر زمانے میں بکثرت موجود ہیں جیسے "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی"۔ یا "سب دہاں بائیس پسیری"۔ یا "آدھے قاضی قدوہ آدھے باوا آدم"۔ یا "رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کا"۔ ان سب کے مفہوم عام ہیں اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب کہاوتوں کا ایجاد کسی خاص زمانے یا واقعے یا حالت سے متعلق ہے جس کی تفصیل و تشریح کا یہ موقع نہیں۔

کہاوتوں کے الفاظ کا صحیح اور سچا ہونا ضروری بات نہیں جس طرح اس زمانے میں یہ تحقیقات۔ کہ ضرب الامثال کب پیدا ہوئیں "کوہ کندن وکاہ برآوردن" سے کم نہیں۔ اسی طرح یہ چھان بین کہ مثل اپنے الفاظ و کامیابی کے لحاظ سے ایسی سچی ہو جس پر سب کو اتفاق ہو فضول ہے۔ ضرب المثل کے لئے شہرت عام کی ضرورت ہے۔ اور یہی پسندیدگی و مقبولیت مستعار الفاظ کو حقیقی معنوں میں جلوہ گر کرتی ہے۔ بعض مثلیں ایسی ملتی ہیں جو اپنے مفہوم میں ایک دوسرے کے ضد ہوتی ہیں۔ اس صورت میں لازمی ہے کہ ایک کو سچ اور دوسری کو غلط مانا جائے حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک مثل ہے کہ "نہایت عمدہ انتقام عفو ہے" اور اس کے برعکس یہ کہاوت ہے کہ "جو شخص انتقام نہیں لیتا وہ ضعیف ہے" اب خیال کرو کہ یہ دونوں مثلیں انسانی طبیعتوں اور واقعاتِ جہاں کے لحاظ سے کس قدر صحیح ہیں اگرچہ اصولاً دو متضاد چیزوں میں سے ایک کو قائم رہنا چاہیئے۔ مگر اپنے موقع و محل کے لحاظ سے بجائے خود ہر ایک صحیح و موزوں ہے۔ آوازِ خلق آوازِ خدا ہے یہ مثل انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہے اگر اس کے لفظی معنی پر خیال کیا جائے تو ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ خدا کی آواز کہاں لیکن اسی آواز سے جو لطف ذوقِ سلیم حاصل کرتا ہے، وہ پوشیدہ نہیں اس بنا پر یہ دعوےٰ صحیح ہے کہ مثل کے الفاظ کا سچا ہونا۔ ضروری نہیں۔

ان چند صفحات میں ضرب الامثال کی مختصر تاریخ و اقسام، اور اسکی ضرورت اور فوائد و نتائج کے متعلق جس قدر وضاحت کی گئی ہے وہ ایک اردو خواں طالب علم کے لئے کافی ہے چونکہ یہ مجموعہ صرف اردو زبان کی ان مثلوں کو پیش کریگا جن کے لئے کوئی نہ کوئی قصہ مشہور ہے۔ اور جس سے ضرب الامثال کی شانِ ورود، وجہ تسمیہ کی طرح معلوم ہو جائے۔ اس لئے اب چند سطریں اس کے متعلق لکھ کر کہ اردو زبان میں کہاوت کب سے بولی یا لکھی جاتی ہے اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔

اردو کہاوتوں کی ابتدائی تحقیق کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے تاریخ اردو پڑھی جائے۔ مگر چونکہ دنیا کی قدیم ترین زبانوں کے زمانوں کی طوالت کے آگے ابھی اردو کو پیدا ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی

نہیں ہوئے، اس لئے یہ بحث ان چند جملوں میں شروع ہوتے ہی تمام ہوئی جاتی ہے، کہ اُردو زبان سے پہلے ہندوستان کی عام زبان ہندی بھاشا یا پراکرت تھی، موجودہ ملکی زبان جس میں بے تعداد اسم و الفاظ مختلف زبانوں سے بگڑ بگڑا کر بولے جاتے ہیں اُنہیں کو اُردو الفاظ کہا جاتا ہے۔ مختلف دور و عہد میں اُردو کی ترکیب۔ زبان اور اسلوب بیان کا رنگ جداگانہ رہا ہے، اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد، یا دکنی قطب شاہیوں کے زمانے تک اُردو روزمرہ کی گفتگو میں بازاری کاروباری چند فقروں سے آگے نہیں بڑھی، اگرچہ قطب شاہیوں میں بعض بادشاہوں نے اپنی ملکی زبان میں شاعری شروع کر دی تھی، مگر اپنی ابتدائی حالت کے لحاظ اور کمی الفاظ کی بدولت اُس زبان اُردو کی مثال مرزا غالب کے اس اُردو شعر سے ملتی جلتی ہے ؎

شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس کے بعد محمد شاہی زمانہ آیا۔ جس میں اُردو شاعری کا شوق عام ہوا، مگر اُس وقت بھی غالب مذاق الفاظ کی اجنبیت اور تراکیب کی غرابت سے لبریز تھا، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

بامن کی بیٹی کل جو مری آنکھ میں پڑی
گالی دیا و غصہ کیا اور دگر لڑی

بہرحال یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ اُردو کا ابتدائی سرا امیر خسرو کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ اُس وقت سے محمد شاہ کے عہد تک کوئی سراغ اُردو نثر کی تالیف و تصنیف کا نہیں ملتا، بایں ہمہ نظم اُردو کی بہتات بتاتی ہے کہ سرمایۂ اُردو میں الفاظ اور اسموں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ اور اُسی کا نتیجہ تھا کہ امیر خسرو کو نصابِ اردو میں "خالق باری" کی تالیف کرنی پڑی۔ اُنکی ہمہ گیر افکار سخن نے جن کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں کو استعارہ و مجاز کا لباس پہنایا ہے اُن میں اکثر اپنی موزونیت و مقبولیت سے ضرب الامثال کا لقب حاصل کر چکی ہیں، اور اسی کو اُردو کے سر افتخار کے لئے تاج کہا جا سکتا ہے مثلاً لوہے کے چنے چبانا، کسی مشکل کام کے لئے بطور محاورہ و مثل بولتے ہیں، اس مفہوم کو امیر خسرو نے ایک روپے کی پہیلی میں ظاہر کیا ہے۔ دیکھنا بالکل آج کل کی زبان معلوم ہوتی ہے ؎

لوہے کے چنے دانت تلے پاتے ہیں اُس کو
کھایا نہیں جاتا ہے وہ پر کھاتے ہیں اُس کو

جس طرح اُردو زبان مروجہ زبانوں سے مل جل کر بنتی ہے، اسی طرح اُس کی کہاوتیں بھی زیادہ تر دوسری زبانوں سے ترجمے کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ بھاشا اور فارسی زبانوں میں سے تو اکثر افعال و الفاظ کا تغیرو تبدل ہُوا ہے مگر اسم بجنسہ رہنے دئے گئے ہیں، جیسے "ہنوز دہلی دور است" کو "ابھی دہلی دُور ہے" بولا جاتا ہے یا "چیز نہ راکھے آپنے۔ اور چوروں کو دے گالی" اس میں "آپنے" اور "راکھے" کو بدل کر اُردو میں رکھے اور آپ کہہ سکتے ہیں۔ بعض مثلیں اپنی سادگی اور سہل معنی کی وجہ سے بالکل اُردو میں اُسی طرح قائم ہیں جیسی اصل میں تھیں۔ مثلاً "اللہ بس باقی ہوس" یا "کبھی ناؤ گاڑی پر کبھی گاڑی ناؤ پر" ہندی بھاشا کی کہاوتیں بکثرت ایسی ملینگی جو بغیر کسی ادل بدل کے اُس وقت تک اُردو میں بولی جاتی ہیں، اور اُن کے تغیر و تبدل کو غیر فصیح اور ناموزوں سمجھا جاتا ہے۔ جیسے "چمڑی جائے دمڑی نہ جائے" یا "تُو کُلا ہے دس ہکا تیس پر بھی تھکم تھکا"، اگر یہاں فصاحت وقتی کا خیال کرتے ہوئے "چمڑی کو چمڑا اور ہکے کو حُقّہ" کر دیا جائے تو معنی میں تو کوئی غلطی نہ ہوگی، مگر وہ بات جو مثل بنتے وقت مدِ نظر تھی ندارد ہو جائیگی، جن مثلوں میں ہندی بھاشا کا کوئی خاص لفظ یا مخصوص ترکیب نہ ہو اُس کو یا تو خالص اُردو کا اختراع سمجھنا چاہیئے یا دوسری زبانوں کا ترجمہ مثلاً: "خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا"، یا "صدائے خلق کو نقارۂ خدا سمجھو"۔ وغیرہ۔

اُمید ہے کہ اتنی ضروری اور مختصر تفصیل و تعریف کے بعد یہ بات اچھی ذہن نشین ہو گئی ہوگی کہ آئندہ اوراق پر جو مشہور افسانے مثلوں کے ساتھ لکھے جائینگے، اُنکے لئے اس تاریخی تحقیقات اور فلسفیانہ چھان بین میں تضیع اوقات کی ضرورت نہیں کہ ایسا واقعہ ہُوا بھی ہے یا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے اور یہی تنہا مقصد مثل ہے کہ جو کہانی اور مثل پیش نظر ہے وہ ممکنات اور واقعات سے مطابقت کرتی ہے یا نہیں۔ اگر تطابق حاصل ہے تو اُس مثل کو مثل سمجھئے ورنہ زٹل۔ باقی اللہ اللہ خیر سلّا ؛

احسن مارہروی

کلامِ گرامی

گفت یار از غیر ما پوشان نظر گفتم بچشم
و نگہے دزدیدہ در ما می نگر گفتم بچشم

(بابا کمال خجندی)

گرامی

گفت میخور غوطہ در خون جگر گفتم بچشم
ریز خوناب جگر از چشم تر گفتم بچشم

گفت شب بر بست رخت آمد سحر اے بوالفضول
داستان شکوہ کم کم مختصر گفتم بچشم

گفت اے حسرت نصیب اے بوالہوس اے ہرزہ گرد
وا مپیچاں ہر طرف تار نظر گفتم بچشم

گفت آب از چشمہ سار چشم ریز اے سست عہد
نخل امید ترا بندد ثمر گفتم بچشم

فاش گفتن رازہا بر حکم عشق آمد حرام
درس گیر از رمز دزدیدہ نظر گفتم بچشم

گفت از عرش آوری شہباز معنی در کمند
حمد ما میخوان باندازِ دگر گفتم بچشم

گفت اے رمز آشنا مانند ماہ و آفتاب
گرد ما می گرد ہر شام و سحر گفتم بچشم

گفت از خود بگسل اے واماندۂ ذوقِ حضور
نیست اینجا امتیاز بام و در گفتم بچشم

گفت چند آخر گرامی ترہاتِ بے اثر
در گلو بشکن نفس اے دردسر گفتم بچشم

جذباتِ آزاد

اہلِ علم کا عالم جنون بھی عام مجنونوں سے ممتاز ہوتا ہے، مولانا آزاد دہلوی نے اپنی اخیر عمر کا ایک طویل حصہ اسی عالم میں گذارا ہے، اس حالت میں بھی وہ اکثر اوقات اپنے مجذوبانہ خیالات کو قلمبند فرمایا کرتے تھے۔ ان تمام تحریروں کو جمع کیا جائے تو کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ آزاد کے شاگرد رشید مولوی سید ممتاز علی صاحب نے "سیاک وناک" کے نام سے ایک مختصر کتاب کی صورت میں ان خیالات کو شائع بھی کیا تھا، جسے دیکھ کر ایک انگریز مصنف نے کہا تھا کہ "یورپ میں مشہور مصنفوں کی عالم جنون کی تحریریں بڑی وقعت سے دیکھی جاتی ہیں۔ آزاد جیسی شخصیت کا مصنف اگر یورپ میں مبتلائے جنون ہوتا تو اسکی مجذوبانہ تحریریں بڑی قبولیت حاصل کرتیں"

اُنکے اندازِ جنون کے متعلق ہم ایک لطیف واقعہ اپنے محترم خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب کی زبانی نقل کرتے ہیں جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ جنونِ علم دیوانگیٔ جہل سے جُدا ہوتا ہے۔ ایامِ جنون میں مولانا آزاد سے شیخ صاحب موصوف نے انکی کسی شائع شدہ تصنیف کی تعریف کی۔ مولانا مرحوم نے کانوں پر ہاتھ رکھ کے فرمایا کہ میری کوئی تصنیف نہیں ہے، یہ کتابیں جو آزاد کے نام سے شائع ہو رہی ہیں یہ دراصل میری نہیں ہیں بلکہ میرے "سٹایو" کی ہیں جو ممتاز علی میرے نام سے منسوب کرتا پھرتا ہے"

شیخ صاحب نے دریافت کیا کہ "سٹایو" کیا ہوتا ہے؟ تو مولانا نے جواب میں کہا کہ "سٹایو" دراصل جاپانی زبان کا ایک لفظ ہے جسکے معنی ہمزاد[1] کے ہیں۔ شیخ صاحب نے اس واقعہ کو "انجمن حمایت اسلام" کے کسی جلسہ میں نقل فرمایا تھا۔ اس کے بعد سے ایک عام اصطلاح گھڑلی گئی۔ کہ جو شاعر کسی دوسرے کے رنگ میں نظم پڑھتا وہ اس کا "سٹایو" مشہور ہو جاتا۔ چنانچہ مدتوں تک یہ اصطلاح نقلِ محفل بنی رہی۔ جو طالب علم خواجہ دل محمد صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج یا ڈاکٹر اقبال کے طرز میں نظمیں پڑھتا "دل محمد کا سٹایو" "اقبال کا سٹایو" کے لقب سے مشہور ہو جاتا تھا۔

ہم آئندہ کبھی کبھی مولانا آزاد کے وہ خیالاتِ جنون جو دلپذیر عبارتوں میں ان کی تصانیف

---

[1] تحقیق سے معلوم ہوا کہ واقعی جاپانی زبان میں "سٹایو" ہمزاد ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بنجری میں اکثر ملتے ہیں۔ ناظرین کی تفریح طبع کے لئے شائع کیا کریں گے ۔

تاجور

اے صادق القول نفسِ ناطقہ کہہ

اے ہمارے دینے والے! تُو نے ہمیں دیا۔ ہم نے تجھ سے لیا۔ تُو ہے دینے والا۔ یہ ہے ناطقہ لینے والا میں ہوں بیچ میں۔ جو تو دیتا ہے میں لیتا ہوں۔ میں لیتا ہوں اور کہتا ہوں یہ کیا ہے؟ تُو کہتا ہے ہاں یہ وہی ہے جو ہم نے کہا تھا۔ اے میرے ایشور تُو نے وہی کیا جو کہا تھا۔ میں وہ نہیں کر سکتا جو وعدہ دیا تھا۔ ہاں تُو ہو میرے وعدہ کا پُورا کرنے والا اے میرے ایشور!

اے میرے ایشور! تُو کر میرا وعدہ پُورا۔ میں تو ہُوں اپنے کام میں کوتاہ۔ جو تُو نے لکھوایا تھا میں نے لکھا تھا۔ اب میں آپ لکھوں تو کیا لکھوں؟ اے میرے بندے ہم لکھواتے ہیں تُو لکھ۔ ہم جانتے ہیں تُو لکھے گا وہی جو ہم کہتے ہیں۔ تو ہے۔ ہم ہیں۔ پھر کیوں نہیں لکھ سکیگا۔

اے میرے ایشور! میں ہوں۔ تُو ہے مگر میں تو اِن میں ہوں یہ اَور ہیں میں اَور ہوں۔ یہ مجھ میں ہو کر آپ کچھ کا کچھ کہہ دیتے ہیں۔ میں حیرت میں ہوں کہ کیا کہوں؟ اور کیا لکھوں؟ تو مجھے وہ دے کہ اِن کا اثر اُس میں نہ ہو!

(اِس کے بعد دُنیا والوں کی شکایت کرتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ یہ کوٹھے پر لڑکے چڑھا دیتے ہیں وہ غل مچاتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور وہاں سے صدا آتی ہے کہ اے بندے میں انہیں بھگا دُونگا کہ یہ پھر کر نہ دیکھ سکیں گے اور کہیں گے خدا جانے یہ کیا ہُوا ۔ یہاں حاشیئے پر لکھا ہے یہ وقت ہے کہ پروفیسر آزاد لکھ رہے ہیں یہ پتا کا جامیا) ۔

تقاضائے محبت

۱

"لیکن جمشید بھائی میں نہیں سمجھی۔ آپ نے اس شخص سے کتنا روپیہ قرض لیا تھا؟"

تارا نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جو کرسی پر بہت ہی غمگین بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جواب دیا "صرف ایک ہزار روپیہ۔ لیکن بے وقوفی یہ ہوئی کہ اُس کاغذ کو نہ دیکھا جس پر اس نے میرے دستخط کرائے یعنی اچھی طرح نہ دیکھا۔ اب مجھے روپیہ لئے ہوئے صرف چھ مہینے ہوئے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ مجھے دو ہزار سے زیادہ دینا ہے۔ اتنا مجھے یاد ہے کہ اس میں پچیس فیصدی کا ذکر تھا لیکن یہ اب علم ہوا ہے کہ مطلب پچیس فی صدی ماہوار تھا۔ وہ بدمعاش ادائیگی کے لئے تقاضا کر رہا ہے۔ اگر ـــــــــ" وہ چپ ہو گیا اور شرم آلود نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی بہن نے سوال کیا "اگر کیا؟"

"اصل میں معاملہ اس طرح ہے" الفاظ اِس کے مُنہ سے رُک رُک کر نکلتے تھے اور وہ بہن کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ "جس وقت اس نے مجھ سے یہ کہا میں بہت دلشکستہ تھا۔ اور اسکا اظہار میرے چہرے سے بھی ہو رہا ہوگا جب میں ساتھ والے ہوٹل میں پانی پینے کی غرض سے میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسی میز پر ایک اور شخص آ بیٹھا اور سلسلۂ کلام شروع ہونے کے بعد مجھ سے نہایت شریفانہ طور پر پیش آیا۔ وہ تمہیں اچھی طرح سے جانتا ہے۔"

"مجھے جانتا ہے؟" لڑکی نے حیران ہو کر کہا "وہ کون تھا؟"

اسکے بھائی نے جواب دیا "سنو تو میں ابھی بتاؤنگا۔ غرضیکہ ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اور اس نے کچھ ایسے طریقے پر ہمدردی کا اظہار کیا کہ میں نے اس سے تمام حال کہہ کر اسکی رائے طلب کی۔ اس نے میرے قرضخواہ کا نام پوچھا۔ اور حسن اتفاق سے رستم جی اس سے واقف تھا۔ اسکا نام رستم جی ہے۔"

اِس نے جیب سے سگرٹ نکال کر جلایا۔ لڑکی اسکے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ آخرکار اس نے پوچھا "ہاں۔ تو اسکے بعد؟"

"ہم دونوں نے وہیں اکٹھے کھانا کھایا اور پھر اس نے مجھ سے کہا" آپ نے سخت غلطی کی لیکن انسان سے ایسا ہو جاتا ہے۔ میں شبوول صراف کو خط لکھے دیتا ہوں کہ آپکو روپیہ ادا کرنے کے لئے کچھ وقت اور دیدے۔ اور اگر ہو سکے تو سود کی شرح بھی کم کرے"۔ اس نے اسی وقت خط لکھ دیا اور دوسرے دن مجھے شبوول کا جواب ملا کہ رستم جی صاحب سے خاص تعلقات ہونیکی وجہ سے وہ میرا پاس ولحاظ کرنے پر مجبور ہے اور اسکے بعد اُسی ہوٹل میں رستم جی سے ملنے پر میں نے اس سے کہا کہ خالی شکریہ کی بجائے اگر کوئی کام میرے لایق ہو تو میں بسر و چشم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اُس وقت تمہارا ذکر آیا اور اس نے کہا کہ وہ تمہیں جانتا ہے۔ یعنی شکل سے اچھی طرح واقف ہے"۔

اس نے اپنی بہن کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے آنکھیں پھیر لیں" باتوں باتوں میں اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اسے تم سے تعارف کا اشتیاق ہے"۔

لڑکی بالکل بے حس و حرکت بیٹھی تھی اُس نے آہستہ سے کہا" ہاں۔ اور آپ نے منظور کر لیا؟"

"تو بہر حال میں اور کیا کرتا؟ وہ ہر طرح سے نہایت شریف آدمی معلوم ہوتا ہے اور اس نے اڑے وقت میں میری امداد کی۔ اسکے عوض اگر تم اُس سے ذرا اچھا برتاؤ کرو تو کیا حرج ہے۔ میں نیچے اسے ابا کے پاس بٹھا آیا ہوں۔ اور جس وقت میں آیا ہمارا دوست نوشیرواں اسکی طرف یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا گویا اسکا دماغ ٹھیک نہیں ہے"۔ اس کا لہجہ بدل گیا اور اب اس میں خوشامدانہ انداز تھا "تارا۔ تارا خدا کے لئے اس وقت جو کچھ بھی ہو سکے کرو۔ تم جانتی ہو کہ والد کی طبیعت کس قسم کی ہے۔ اور خاص طور پر جب میرے لئے پہلی دفعہ بھی نہیں ہے۔ اگر انہوں نے سُن پایا تو آفت ہی آجائیگی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ گذشتہ بار انہوں نے کہا تھا کہ اگر ایسی بات دوبارہ ہوئی تو مجھے گھر سے نکال دینگے۔ ان سے یہ کچھ بعید نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم رستم سے قدرے التفات کے ساتھ پیش آؤ"۔

تارا نے اسکی طرف ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ سے: "بھیا! اگر جس طرح آپ کہتے ہیں رستم جی کے لئے میرا التفات سے پیش آنا کافی ہوگا تو مجھے کوئی عذر نہیں لیکن ———"

اسکی پیشانی پر بل آگئے اور وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی" آؤ میں اسے دیکھوں تو سہی"۔

چپ چاپ وہ سیڑھیوں سے اُتر گئے۔ چائے میز پر آ چکی تھی اور ایک ایک کر کے گھر کے

تمام آدمی کمرے میں جمع ہونے لگے تھے۔ لیکن تارا کی نگاہ اور سب سے گذر کر اُس آدمی پر جم گئی جو اُس کے والد سے باتیں کر رہا تھا۔ یا اگر درست کہا جائے تو اس کا والد جس سے کہہ رہا تھا۔

"چھ بجے ایک گاڑی واپس شہر کو جاتی ہے۔ آپ اُس پر پہنچ سکتے ہیں"

جمشید جلدی سے آگے بڑھا اور گھبرا کر کہنے لگا "لیکن ابا میں نے رستم جی سے رات کو یہیں قیام کرنے کے لئے کہا تھا۔ اور میں نے تارا سے بھی پوچھ لیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ بندوبست ہو جائیگا"

تارا نے مسکرا کر ہاتھ بڑھا دیا "رستم جی صاحب آپکا مزاج تو اچھا ہے؟ آپ ضرور رات کو یہیں ٹھیریں" اور پھر آہستہ آہستہ وہ چائے کی میز کی طرف چلی۔ رستم جی ایسا بُرا آدمی نہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسا کہ اُسے خیال تھا۔ گو اُسکے لباس کو اگر غور سے دیکھا جاتا تو قدرے ضرورت سے زیادہ شوخ تھا پھر بھی وہ شریف . . . . ہاں شریف آدمیوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔

"بائی جی اس وقت تو آپ نے ایک جنگ عظیم کو روک دیا ہے"۔ ایک ہلکی سی آواز نے یہ کہہ کر اسکے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیا اور وہ مسکرا کر اسکی طرف مخاطب ہوئی۔

"بعض وقت تو والد حد سے گذر جاتے ہیں۔ اور جمشید بھائی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ آپ بھی اسکی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ کیا بات تھی؟"

نوشیرواں نے ہنس کر کہا اُس نے آتے ہی آپکے والد کی رائے کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اور وہ بھی گھوڑ دوڑ کے مضمون پر۔ اس پر آگ بھڑک اُٹھی۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ رستم جی کا ان سے کتنی مدت سے دوستانہ ہے؟"

"مجھے علم نہیں" لڑکی نے کہا "لیکن آپکو یہ بھی یاد ہے کہ پہلی دفعہ جب ہم نے آپکو اپنے مکان پر مدعو کیا تھا تو ہمارا آپ سے کتنی مدت سے دوستانہ تھا؟"

یہ کہہ کر تارا کسی دوسرے مہمان کی طرف مخاطب ہو گئی اور اس لئے وہ اُس پر اسرار چمک کو نہ دیکھ سکی جو نوشیرواں کی آنکھوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور نہ اسکی مٹھیوں کا زور سے بند ہو جانا اسکی نگاہ سے گذرا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد جب وہ دوبارہ اسکی طرف آئی تو اسکے چہرے پر کوئی خلاف معمول اظہار نہ تھا۔ جب اُس نے کہا "آپکے فقرے سے میں اپنی سزا کو پہنچ گیا۔ لیکن کیا اتنا عرض کرنا بھی گستاخی ہوگا کہ بعض دفعہ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے"

"تو کیا آپکے خیال میں میرے بھائی نے غلطی کھائی ہے؟"

"باریک بیں آنکھ کے لئے تو ظاہر ہے۔ لیکن اس معاملہ میں مجھے کچھ اندرونی علم بھی ہے"

"یعنی آپ رستم جی کو پہلے سے جانتے ہیں؟"

نوشیرواں نے سر کو ہلایا "ہاں میری ——— ان سے پہلے ملاقات ہو چکی ہے"

لڑکی نے کہا "لیکن وہ تو آپ سے واقف نہیں ہے"

"ہاں۔ کم از کم ——— خیر۔ اس معاملے کو آپ یہیں رہنے دیں۔ اور میں مشکور ہونگا۔ اگر گفتگو کے سلسلے میں آپ اُسے نہ بتائیں کہ میں اُسے جانتا ہوں۔ اور اگر مجھے اجازت دیں کہ جتنا عرصہ وہ اس مکان میں ٹھیرے۔ میں بھی ٹھیروں"

تارا نے مٹھائی کی رکابی اُٹھا کر اُسے دیتے ہوئے کہا "آپ عجیب اُلجھی ہوئی باتیں کرتے ہیں آپ بڑی خوشی سے ٹھیریں۔ لیکن کیا آپکا ابھی سے چلے جانے کا ارادہ تھا؟ کیا آپکو یہاں کسی قسم کی تکلیف ہے؟"

اس نے آہستہ آہستہ جواب دیا "نہیں تکلیف کیوں ہوتی۔ میں نے اپنی زندگی میں دُنیا کے بہت سے کونے دیکھے ہیں۔ اور میں نے خواب میں بھی کبھی ایسے لطف سے دن نہ گذارے تھے جیسے میرے یہاں گذرے ہیں۔ آپ لوگوں نے مجھے اُن واقعات کا خوش آئند خیالی نظارہ دکھادیا ہے۔ جو ہو سکتے تھے اگرچند باتیں جو ہو چکی ہیں نہ ہو چکی ہوتیں۔ تارا۔ کچھ اور تجربہ ہونے کے بعد آپ کو ایک تکلیف دہ سچائی کا علم ہوگا کہ کوئی فرد بشر بھی بالکل وہ نہیں ہو سکتا جو وہ نظر آتا ہے۔ ظاہرا صورت ہمیشہ ظاہر ہوتی ہے۔ باطن کا حال یا وہ خود اور یا اسکا خدا جانتا ہے"

وہ یک لخت اُٹھ کر کمرے میں دوسری جانب چلا گیا اور مہمانوں سے اپنی عادت کے موافق نہایت پُر اخلاق طریق سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ تارا کی نظر کچھ عرصہ اُس پر جمی رہی اور پھر وہ اپنے کام میں لگ گئی۔ آج پہلی دفعہ نوشیرواں نے اس کا نام لیا تھا۔ تارا کو اچھی طرح علم تھا۔ کہ پہلی دفعہ تھی اور اس واقعہ نے اُن تمام پُراسرار باتوں کو جو وہ کرتا رہا تھا اس کے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ؁

۲

رات کے کھانے کے بعد جب مکان سے نکل کر وہ چمن کی ایک روش پر ٹہل رہی تھی تو وہ کام اسے کرنا پڑا جس کے لئے بھائی سے وعدہ کر چکی تھی۔ یعنی رستم جی وہاں آگیا۔

وہ چمن میں اس اُمید پر گئی تھی کہ شاید کوئی اور وہاں آجائیگا لیکن اُسکی بجائے رستم جی اپنے ضرورت سے زیادہ پُرادب انداز اور بے طرح سی مسکراہٹ کو ناکامیاب طریق پر ضبط کئے ہُوئے آپہنچا۔ اس کے دل میں گھبراہٹ سی محسوس ہُوئی لیکن مجبور تھی۔ اگر بھائی کو خوش کرنا اور ایک آفت سے بچانا مقصود تھا تو رستم جی سے باخلاق پیش آنا ضروری تھا۔

کچھ عرصہ تک معمولی مضامین پر گفتگو ہوتی رہی۔ تارا کے دل میں خواہش تھی کہ کسی اور کے آجانے سے یہ وقت ٹل جائے۔ لیکن اندر تاش اور بلیرڈ کھیلا جا رہا تھا۔ غالباً اب اسے لازم تھا کہ بھائی کی مدد کرنے کے لئے رستم جی کا شکریہ ادا کرے۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور ہمت کر کے اس نے پہلا مرحلہ طے کر لیا۔

"رستم جی صاحب مجھے بھائی سے علم ہُوا کہ آپ نے اس ——— اس روپے کے معاملہ میں انکی بہت امداد کی۔"

رستم جی نے اپنا ہاتھ بے پروائی کے انداز سے ہلایا۔ "بائی جی اس کا ذکر نہ کیجئے۔ گو واقعی اس معاملے میں کچھ کارروائی کرنا ضرور ہوگی۔ اور وہ بھی جلدی"

"لیکن اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ نے اُن لوگوں کے ساتھ کچھ عرصہ تک چُپ رہنے کا فیصلہ کرا دیا ہے؟"

رستم جی نے سمجھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جسکا اُسے انتظار تھا۔ اور موقع بھی ایسا ہے جسکے اتنی جلدی مل جانے کی اسے اُمید نہ تھی۔ "ہاں کسی حد تک تو درست ہے۔ شبو مل صراف کے کاروبار کے کئی حصے ہیں۔ جن میں سے ایک روپیہ قرض دینا ہے۔ چونکہ میرا پیشہ بھی جواہرات میں لین دین کرنا ہے۔ مجھے اپنے کاروبار میں ان سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اس لئے انہوں نے میری سفارش سے روپیہ کا تقاضا فی الحال چھوڑ دیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ سود کی شرح بھی قدرے کم لگانے پر رضامند ہو جائیں۔ لیکن بائی صاحبہ ——— وہ ——— وہ ایک اور معاملہ ہے ——— جس میں آفت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔"

لڑکی نے بہت حیرانی سے اسکی طرف دیکھ کر پوچھا "وہ دوسرا معاملہ کیا ہے؟"

"تو کیا جمشید جی نے آپ سے ذکر نہیں کیا؟ اس...... اس حالت میں شاید ——— مجھے بھی نہ کرنا چاہیئے تھا"

"نہیں آپ براہ مہربانی کیے جائیں" اسکی آواز بہت دھیمی تھی" یہ دوسری بات کیا ہے؟"
کچھ عرصے تک اس نے یہ ظاہر کیا کہ اسے یہ بھید بتانے میں تامل ہے۔ اور وہ کسی حد تک اس طرح اپنے دلی جذبات کو چھپانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اور پھر گویا مجبور ہو کر اس نے جواب دیا "میں آپ سے چھپا نہیں سکتا۔ سچ یہ ہے کہ یہ بات آپکے بھائی صاحب نے مجھ سے نہیں کہی بلکہ شبول والوں کے ایک حصہ دار سے گفتگو کے دوران میں مجھے معلوم ہوئی۔ چند ہفتے ہوئے جمشید جی نے ایک دوکان سے ایک موتیوں کا گلوبند خریدا اور اس کی قیمت ادا نہ کی۔ اپنے معتبر ہونیکے ثبوت میں آپکے والد صاحب کا نام لیا۔ دوکان والوں نے وہ گلوبند اُدھار دیدیا۔ اسکی قیمت تقریباً آٹھ سو روپیہ تھی لیکن آپکے بھائی نے بجائے اسکے کہ جسکے واسطے وہ خریدا تھا اُسے دیدیتے۔ بیوقوفی کی حد سے زیادہ تجاوز کیا اور دائرہ جرم میں قدم رکھدیا"

لڑکی نے خوف زدہ ہو کر دریافت کیا" آپکا مطلب کیا ہے؟"

"یعنی اس نے وہ گلوبند جو ادھار لیا تھا۔ گروی رکھدیا۔ اب مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ جس سے وہ گلوبند خریدا گیا تھا اُسے یہ بات معلوم ہو گئی ہے۔ جمشید جی نے جہاں وہ گلوبند رکھا تھا وہ شبول والوں ہی کے کاروبار کا ایک حصہ ہے۔ انہوں نے اسکے عوض پانچسو روپیہ دیدیا تھا۔ لیکن دو تین دن ہوئے روزانہ لین دین کے سلسلے میں انکے پاس وہ گلوبند اصل مالک نے دیکھ کر پہچان لیا۔ اور دریافت کرنے پر جب اسے معلوم ہوا کہ بکاؤ نہیں ہے وہ سمجھ گیا کہ جمشید جی نے گروی رکھ دیا ہوگا۔ اس پر معاملہ بگڑ گیا"

"تو کیا آپکا خیال ہے کہ ——— وہ اسے ——— قید کرا دینگے؟"

اگر جلدی ہی کوئی بندوبست نہ کیا گیا تو عدالت میں کارروائی شروع ہو جائیگی۔ بعض باتوں میں کاہن چند ———" پاس والی جھاڑی کے پیچھے اندھیرے میں آہٹ ہوئی اور وہ جلدی سے مڑ کر دیکھنے لگا لیکن اُسے کچھ نظر نہ آیا اور پھر سناٹا ہو گیا" کاہن چند بعض باتوں میں بہت سخت واقع ہوا ہے۔ میرے خیال میں آپکو یہ بتانے میں کوئی حرج نہ ہوگا کہ وہ گلوبند جمشید جی نے کاہن چند جوہری کی دوکان سے خریدا تھا۔ مختلف دوکانداروں کی عادات مختلف ہوتی ہیں۔ وہ ایسی بات کو کبھی نظر انداز نہیں کریگا"

"لیکن کیا آپ بات چیت کر کے اُسے سمجھا نہیں سکتے؟"

رستم جی نے کہا "بائی جی میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپکے بھائی کو ضرورت تھی اور اس نے روپیہ حاصل کرنے کے لئے یہ مجرمانہ طریق اختیار کیا۔ آپ خود ہی انصاف کریں میں کس طور سے اس معاملہ کو صاف کر سکتا ہوں؟"

"تو رستم جی صاحب کیا بالکل کچھ بھی نہیں ہو سکتا؟" اسکے دونوں ہاتھ آپس میں زور سے ملے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں تردد تھا۔ ہونٹ قدرے کھلے ہوئے تھے اور سانس جلدی جلدی لے رہی تھی۔ ایک دفعہ پھر جھاڑی کے عقب میں آہٹ ہوئی۔

لیکن رستم جی اس وقت اتنا مشغول تھا کہ اس نے پروا نہ کی۔ تارا جسے چھ ماہ گذرے ایک تھیٹر میں دیکھنے پر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اسکے اتنا نزدیک اور تنہا ہونے سے وہ اس قدر متاثر ہو رہا تھا کہ اس کا ظاہری ملمع دور ہو کر طبعی اصلیت اپنا رنگ دکھانے لگی تھی۔

اس نے قدرے بیٹھی ہوئی آواز سے کہنا شروع کیا "ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔ اور اُمید ہے۔ آپ سمجھ جائینگی کہ آپ کے بھائی کا معاملہ ضروری ہے اور میں مجبور ہوں ورنہ اس قدر عجلت سے کام نہ لیتا اگر میں کاہن چند سے جا کر کہدوں کہ عدالت میں جانے سے میری ذات پر بُرا اثر پڑیگا۔ تو میرا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے سے باز رہ جائیگا۔"

لڑکی کی آنکھوں میں تعجب ظاہر ہونے لگا۔ اسکے منہ سے نکلا "آپکی ذات پر؟"

"مثلاً اگر میں اُس سے کہہ سکوں کہ خاندانی تعلقات کی وجہ سے اگر وہ معاملے کو رفع دفع ہو جانے دے تو مجھے بہت ممنون کریگا۔ اس صورت میں اُمید ہے وہ مان جائیگا۔"

وہ یکلخت اُٹھ کھڑی ہوگئی۔ تعجب خوف سے بدل گیا۔ اسے کچھ کچھ اصل مطلب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس نے قدرے سختی سے کہا "رستم جی صاحب آپکا یہ کہنے سے منشا کیا ہے؟"

ملمع بالکل جاتا رہا "اگر میں اُس سے کہہ سکوں کہ آپکے کنبے میں میری شادی ہونے والی ہے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ وہ کوئی کارروائی نہیں کریگا۔"

"آپ سے شادی کر لوں؟" غصّے اور نفرت سے تارا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"ہاں مجھ سے شادی کر لو یا اپنے بھائی کو جیل میں دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ روپیہ اُسے بچا نہیں سکتا اس لئے اپنے والد کے بھروسے پر نہ رہنا۔" اور پھر اس نے اپنے لہجے کو بدل دیا "اس میں حرج بھی کیا

ہے بائی جی؟

چھ مہینے ہوئے جب سے میں نے آپکو ایمپائر تھیٹر میں دیکھا ہے۔ میں پاگل ہورہا ہوں۔ میری آمدنی کافی سے زیادہ ہے ———"

وہ تارا کی طرف ہاتھ پھیلاکر بڑھا اور وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اسکا چہرہ کپڑے کی طرح سفید ہورہا تھا اور اس کی مٹھیاں بند تھیں۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے جب وہ بنچ سے جالگی اور زیادہ ہٹنا ناممکن ہوگیا۔ تو اسکا خون جوش کھانے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ اسے صرف ایک خیال کا احساس تھا کہ اسکے مُنہ پر تھپیڑ مارے۔ رستم جی بھی اسکا مفہوم سمجھ کر رُک گیا۔

اس وقت دخل در معقولات کا آغاز ہوا یعنی پام کے پودوں کے عقب میں سے ایک ایسی آواز آئی گویا کوئی نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ ایک کرسی اُلٹتی ہوئی معلوم ہوئی۔ رستم جی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تارا کا ہاتھ نیچے ہوکر اپنی اصلی جگہ پر آگیا اور کچھ ٹہنیاں ایک طرف کرکے نوشیروان اپنی آنکھوں کو ملتا ہوا۔ روش پر آکھڑا ہوا۔

ایک جمائی لیکر اور رومال سے منہ پونچھ کر وہ کہنے لگا" بائی جی غالباً میں سو گیا تھا۔ بہت اچھا کھانا ہو تو انسان زیادہ کھاجاتا ہے۔ ایسی حالت میں نیند آجانا گو بُری بات ہو لیکن مزیدار ضرور ہوتا ہے۔ رستم جی صاحب آپکا کیا خیال ہے؟" اُس نے رستم جی کی روئی صورت کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اپنے کپڑوں کو دُرست کرنے لگا۔

اُس نے جلے بُھنے انداز سے کہا" آپ معلوم ہوتا ہے کہ بہت خاموشی سے سوتے ہیں"

"ہاں اِس خموشی کے لئے میں اپنے اسکول میں ہمیشہ انعام حاصل کیا کرتا تھا۔ کیونکہ جماعت میں خراٹے لینے سے اُستاد کے خیالات منتشر ہوجاتے ہیں"

رستم جی مُڑ کر مکان کی طرف چلا اور آہستہ سے کہنے لگا" بائی جی کل تک اُمید ہے کہ آپ میری تجویز پر غور کرکے مجھے جواب دے سکینگی۔ اور غالباً کسی ایسی جگہ مجھے ملاقات کا موقع دینگی جہاں لوگ زیادہ کھانا کھاکر سو نہیں رہے ہونگے" پھر سلام کا اشارہ کرکے چلا گیا۔ تارا ایک ٹھنڈی سانس لیکر بنچ پر بیٹھ گئی +

رستم جی کی پشت کی طرف دیکھتے ہوئے نوشیرواں کہنے لگا" واہ کس قدر بااخلاق جانور ہے"

تارا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "تو کیا آپ سن رہے تھے؟"

اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا "بیشک۔ اسی لئے تو میں وہاں بیٹھا ہوا تھا"

"لیکن پھر آپکو اس سے پہلے نکل آنا چاہیئے تھا"

"میں یہ سننا چاہتا تھا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اور آخر میں یہ نہ چاہتا تھا کہ آپ اُسے تھپیڑ ماریں اس لئے میں آگیا"

"یہ کس لئے؟ اس کا مُنہ ایسے ہی سلوک کے قابل تو تھا"

"یہ میں بھی جانتا ہوں۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر آپ ایسا کرتیں تو مجھے بیحد لطف آتا لیکن ابھی اس کا وقت نہیں ہے اور آپکو کل رات کھانے کے بعد اسکے ساتھ ٹہلنے کو جانا ہوگا"

تارا نے چلاّ کر کہا "ہرگز نہیں"

"نہیں یہی مناسب ہے" نوشیرواں نے ملائمت سے جواب دیا "ابھی اسے کچھ عرصہ اُمیدواری کرنے دیجئے۔ بالکل جواب دینا اچھا نہیں"

"لیکن کیوں؟"

"کیونکہ یہ لازمی ہے کہ وہ کم ازکم پرسوں تک آپکے یہاں ٹھیرے"

لڑکی نے حیرانی سے کہا "میں بالکل نہیں سمجھی"

"وقت پر سمجھ جاؤ گی" لڑکی کو احساس ہُوا کہ نوشیرواں کی آواز میں غم کی جھلک پیدا ہوگئی "فی الحال آپکو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ . . . . تارا . . . کیا مجھ پر اس قدر یقین رکھ سکتی ہو؟"

"مجھے آپ پر کامل یقین ہے" اس سے نوشیرواں کے دل پر چوٹ سی لگتی ہوئی معلوم ہُوئی۔

"تو میرے واپس آنے تک رستم جی کو یہیں رکھنا"

بے اختیار لڑکی کے منہ سے نکلا "تو کیا آپ جارہے ہیں؟"

"ہاں کل سویرے ہی۔ اور جتنی جلدی ممکن ہوا واپس آجاؤنگا"

ایک دو لمحے کے لئے وہ چُپ چاپ کھڑے رہے۔ تارا نے دیکھا کہ نوشیرواں جی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور پھر اُس نے آنکھیں اُٹھائیں تو وہ جا چکا تھا۔

وہ اندر مکان میں آئی تو نوشیرواں جی اسکے بھائی کے ساتھ کونے میں کھڑا باتیں کر رہا تھا پھر کسی نے بلیرڈ کھیلنا تجویز کیا۔ جو بہت اچھا کھیل ہے لیکن جس میں اگر کھیل کی طرف دھیان نہ ہو تو میز کے ربڑ کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونا عقلمندی سے بعید ہے۔ وہ رستم جی کا ہاتھ تھا۔ اور پتھر جیسی سخت گیند کے پورے زور میں اس پر لگنے کا لطف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے خود چکھا ہو۔ چوٹ اتفاقیہ معلوم ہوتی تھی اور نوشیرواں جی نے جو کھیل رہا تھا کئی دفعہ معافی طلب کی لیکن اس ہلچل کی اثناء میں جو فوراً کمرے میں پیدا ہوئی۔ تارا کی آنکھ نوشیرواں کی ظاہرا بیگناہ آنکھ سے ملی اور وہ منہ کے آگے رومال رکھ کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ ایسی حالت میں نہ رک سکنے والی ہنسی کا اسی کمرے میں اظہار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

۳

مندرجہ بالا واقعات سے تیسرے روز ایک بانکا ٹیڑھا نوجوان ضرورت سے زیادہ شوخ رنگ کا لباس پہنے صبح دس بجے کے قریب کاہن چند جوہری کی دوکان پر آیا اور اسکے نوکر سے پوچھنے لگا:۔

"ابے او! لالہ جی کدھر ہیں؟"

نوکر نے سوال کیا "آپکو ان سے کیا کام ہے؟"

"بدتمیز کہیں کا۔ تجھے اس سے کیا غرض؟ جا کے لالہ جی سے کہدے کہ ہمیں رستم جی صاحب نے بھیجا ہے"

نوکر اندر گیا۔ اور فوراً ہی باہر آکر اسے ساتھ لے گیا۔

"رستم جی صاحب نے بھیجا ہے؟ کیا ہوا خیریت تو ہے؟" کاہن چند یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھا اور اسے ایک اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نوجوان نے ایک قہقہہ لگایا "اس نے کام مار لیا استاد۔ اس وقت ہمارا دوست رستم جی بڑی شان سے اس سونے کی چڑیا کا مالک بنا بیٹھا ہے"

"ارے کیا سچ؟ پھر تو کمال کیا ہے ظالم نے" کاہن چند نے زور سے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔

"اسی لئے تو میں آیا ہوں۔ میں شیو لال کی دوکان میں کام کرتا ہوں۔ ہمارا رستم اپنی ہونیوالی بیوی کو ایک چھوٹا سا تحفہ علی الحساب دینا چاہتا ہے" وہ پھر ہنسا اور جیب کو ٹٹولنے لگا "یہ لو۔ اور ایک رسید لکھ دو کہ گلوبند جو پسند کرانیکی غرض سے لیا گیا تھا وہ واپس وصول ہوا" اس نے آنکھ ماری "بھئی کیا کہیں رستم جی

اپنے فن میں یکتا ہے"۔ وہ دوسرے آدمی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک نہایت خفیف سی فکر کی جھلک تھی"۔ "وہ لڑکی کو یہ رسید دیکر سودا پختہ کیا چاہتا ہے"۔

"لیکن" کاہن چند نے پوچھا "رستم جی نے مجھے ٹیلیفون کے ذریعے سے خود کیوں نہ کہدیا"؟

نوجوان پھر زور سے ہنسا "واہ۔ آج سویرے مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑکی کے مکان میں ٹیلیفون ہال میں لگی ہوئی ہے جہاں ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ رستم جی دبی ہوئی آواز سے ٹیلیفون پر جھنجھلا رہا تھا "اسے کاہن چند کے پاس لے جاؤ ——— "ہاں۔ پسند کرانے کے واسطے لیا تھا ——— دکھانے کے لئے نالائق" اور پھر ٹیلیفون سے مڑ کر "تسلیم ——— یہ ذرا اپنے مکان پر ملازم کو ہدایات دے رہا ہوں"۔ پھر دوبارہ مجھ سے "سنا؟ اچھی طرح سمجھ گئے؟" میں نے جواب دیا "ہاں میں نے سمجھ لیا ہے آپ چاہتے ہیں کہ میں گلوبند لالہ کاہن چند کے یہاں پہنچا کر رسید لے آؤں کہ دکھانے کے لئے گیا تھا۔ اور اس روپے کا کیا ہوگا جو جمشید نے ہم سے قرض لیا تھا؟" اس نے کہا "اسکا اصل کاغذ رسید کے ساتھ مجھے بھیجدو۔ میں ذرا ٹہلنے کو جا رہا ہوں" رستم جی اور ٹہلنا .... ہا .... ہا ...... ہا ......"

اُس نے قہقہہ لگایا جس میں کاہن چند بھی شامل ہوگیا۔ اور پھر کہنے لگا۔

"ہاں بیشک رستم جی بڑا پکا ہے۔ مجھے یقین نہ تھا کہ وہ اسے پھانسنے میں کامیاب ہوجائیگا۔ گو میرے خیال میں ہے بیوقوف۔ وہ آپس میں کتے بلی کی طرح لڑا کرینگے" اس نے میز پر سے گھنٹی بجائی اور ایک دراز کھول کر گلوبند کو اس میں رکھ دیا۔ کلرک اندر آیا تو اسے ایک رسید کا فارم لانے کو کہا اور اس پر مہر لگا کر دستخط کرتے ہوئے اس نے نوجوان سے سوال کیا "کیا وہ دوسرا کاغذ لائے ہو؟"

اس نے جواب دیا "ہاں۔ یہ لو۔ ان دونوں کو لفافے میں ڈال کر رستم جی کا پتہ لکھ دو۔ میں جاتے ہوئے اسے ڈاک خانے میں دیتا جاؤنگا"۔

اسکے دو منٹ بعد وہ باہر کے دفتر سے نکل کر بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ لیکن ابھی دو گھنٹے گذرنے نہ پائے تھے کہ کاہن چند نے اس روز کا تازہ اخبار کھولا اور اسکا دل دھک سے رہ گیا۔

"ایک مشہور دکان میں دلیرانہ چوری

گذشتہ رات اس شہر میں ایک دلیرانہ چوری کا ارتکاب ہوا۔ شبو مل صراف کی دکان میں سے

ان کا لوہے کا صندوق توڑ کر بعض اشیاء چور نکال کرلے گیا۔ نقصان کا صحیح اندازہ ابھی معلوم نہیں ہوا۔ آج صبح انکا چوکیدار ایک کمرے میں رسیوں سے بندھا ہوا پایا گیا۔ اسکے منہ میں کپڑا ٹھسا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے ماہر چور کا کام ہے۔ پولیس سراغ لگا رہی ہے"

اس وقت جب کاہن چند کی پھیلی ہوئی آنکھیں اخبار کے ورق پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک نوجوان بھی جو پارسی ٹوپی اور نہایت عمدہ شریفانہ لباس پہنے تھا ریل کے ایک کمرے میں ہی اخبار دیکھ رہا تھا اور خود بخود کہہ رہا تھا۔

"پولیس سراغ لگا رہی ہے" واہ کیا کہنے ہیں پولیس کے۔ خوب دماغ لڑاؤ بیٹا۔ ماہر چور۔ شاباش بھئی کام بھی تو نہایت صفائی سے ہوا۔ گو مجھے یہ نہ کہنا چاہیئے"

اِن الفاظ کا ایک نہایت شریف صورت اور شریفانہ پوشاک والے اول درجے کے مسافر کے زبان پر آنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن ایک بات اس سے بھی زیادہ عجیب تھی اگر کوئی ذریعہ اسکے معلوم کرنیکا ہوسکتا یعنی اسی ٹرین میں ڈاک کی تھیلی میں ایک لفافہ تھا جس میں پہلے تو دو کاغذ ڈالے گئے تھے اور مکتوب الیہ مرد تھا لیکن اب جس میں تین کاغذ تھے اور مکتوب الیہ عورت تھی جس سے خطوط کے ڈاک میں ڈالنے کے وقت خاص احتیاط کی ضرورت کا اظہار ہوتا ہے +

۴

"آداب عرض رستم جی صاحب۔ کہیئے کیا حال ہے۔ مزاج تو اچھا ہے؟"

یہ کہہ کر نوشیرواں مسکراتا ہوا ہال میں اس شان سے داخل ہوا کہ قریباً اس سے "ٹکرا گیا"۔ آج آپ غمگین سے نظر آتے ہیں۔ کس بات کا ملال ہے؟"

لیکن رستم جی کی رونی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس مذاق کو محسوس کرنیکے قابل نہ تھا ابھی ابھی اسے ٹیلیفون پر ایک پیغام ملا تھا جس نے اسکی طبیعت میں گڑبڑ پیدا کردی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ تازہ اخبار کا پرچہ جو نوشیرواں لئے ہوئے تھا اسکے ہاتھ سے گھسیٹ لیا اور ورق الٹنے لگا۔ اتنے میں نوشیرواں کو ہال کے دوسرے سرے پر تار نظر آئی اور اسکی سانس رک گئی۔ گذشتہ دو دنوں میں مصروفیت کی وجہ سے وہ اسکو قریباً بھول ہی گیا تھا۔ اب آنے والے واقعات کا خیال اسکے گلے میں اٹک گیا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھال کر بڑھا اور حسب معمول مسکرا کر اسکا استقبال کیا۔

اس نے شوق بھرے لہجے میں آتے ہی پوچھا "کہیئے کیا خبر لائے؟"

"بہت"۔ اس نے آہستہ سے کہا "سب سے اول یہ کہ ایک حقیر گناہ گار کو ایک نہایت حسین لڑکی سے اُلفت ہوگئی ہے اور وہ بھی اِس درجہ کی جسکا اُسے کبھی خواب و خیال بھی نہ تھا کہ انسان کو انسان سے ہوسکتی ہے"۔ اس کی آواز رُکنے لگی لیکن اس نے اپنے آپکو سنبھال کر کہا "دوسرے یہ کہ اس حسین لڑکی کے نام ڈاک میں آج ایک بڑا سا رجسٹری شدہ لفافہ آنے والا ہے۔ پتہ ٹائپ کیا ہوگا اور شہر کی مہر ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ حسین لڑکی اُسے میری موجودگی میں کھولدے۔ سمجھ گئیں؟"

لڑکی نے نہایت آہستگی سے جواب دیا "ہاں سمجھ گئی"۔ اسکی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی تھی ✦

"یہ دیکھا ہے؟" دوسرے رستم جی کی آواز نے جو غصے سے کانپ رہا تھا نوشیرواں کو اس کی طرف مڑ کر مخاطب ہو جانے پر مجبور کیا۔

"کیا دیکھا ہے میرے عزیز دوست؟" اس نے آگے بڑھ کر اخبار کا پرچہ رستم جی کے ہاتھ سے لیتے ہُوئے کہا "یہ چوری کی بابت؟ یہی نہ؟ توبہ ہے۔ یہ بدمعاش لوگ بھی کس قدر دلیر ہوتے ہیں۔ شبول صرف کی دوکان چوکیدار کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اور ماہر چور۔ بیشک قابلِ افسوس ہے پھر بھی آپ اس قدر گھبرا کیوں گئے؟ شبول کی جیب آپکی جیب تو نہیں ہے"۔ وہ مزے سے مسکرا کر باتیں کر رہا تھا اور اس بات کی طرف مطلق دھیان نہ دیتا تھا کہ رستم جی کے چہرے کی کیا حالت ہے۔

اُس نے دانت پیس کر کہا "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں اس سے پہلے کہاں دیکھا ہے"۔ دوسرے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "یقیناً کبھی نہیں۔ ورنہ آپکے بے نظیر خط وخال میرے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو گئے ہوتے۔ لیکن ممکن ہے کہ آپ نے مجھے کسی مذہبی مباحثہ یا عبادتگاہ میں دیکھ پایا ہو۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ وہ لو ڈاک آگئی"۔

اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جو اسکی طرف حیرانی سے تک رہی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں وہ بات ہوگئی جو لڑکی کے لئے باعث راحت اور اُسکے لئے دُنیا میں سب سے میٹھا اور ساتھ ہی سب سے زیادہ تکلیف دہ پیغام تھا۔ پھر اس نے ہال میں سے برآمدہ میں آکر میز پر سے چٹھیوں کو اُٹھالیا اور بآواز کہنے لگا "یہ لیجئے بائی جی۔ یہ آپکی چٹھی کسی دوکاندار کے یہاں سے آئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے ابھی کھول ڈالیں۔ کیونکہ اگر ضرورت ہُوئی تو رستم جی صاحب آپکو ہر ایک قسم کا قیمتی مشورہ دے سکینگے"۔

تارا نے کانپتی ہُوئی اُنگلیوں سے وہ لفافہ کھولا۔ لیکن اس میں سے جو کاغذات نکلے رستم جی کی ان پر نگاہ

پڑتا تھی کہ اس نے ایک ایسی حرکت کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انہیں چھین لینا چاہتا ہے۔ لیکن اُسی لمحے میں اسکے ہاتھ کو ایک لوہے سے سخت ہاتھ کی ضرب لگی اور نوشیرواں کی آنکھیں اسکی آنکھوں کے مقابل چمکنے لگیں "واہ صاحب یہ کیا؟ ایسا پھر کبھی نہ کیجئے گا"

لڑکی نے حیران ہوکر پوچھا "میں تو نہیں سمجھ سکی کہ یہ کاغذ کیسے ہیں"۔ نوشیروان نے ہاتھ بڑھایا اور اس نے وہ کاغذ اسکے ہاتھ میں دیدیئے۔

"یہ مسروقہ ہیں" رستم جی کا چہرہ نیلا ہو گیا تھا "مجھے دیکھنے دو"

نوشیروان نے قدرے سختی سے کہا "ذرا صبر کیجئے" اور پھر اپنے معمولی انداز میں "یہ تو کاہن چند کی دکان کی رسید ایک گلوبند کے واپس وصول پالینے کی بابت ہے جو جمشید جی صاحب کو پسند کرا نیکی غرض سے دیا گیا تھا"۔

تارا نے خفگی کے لہجے میں رستم جی سے پوچھا "لیکن آپ تو کہتے تھے کہ اُس نے اُدھار خرید کر اسے گرو ی رکھ دیا ہے؟"

"ٹھیک تو تھا۔ یہ رسید جعلی ہے"۔ رستم جی کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی۔

"اوہو کیا واقعی؟" نوشیرواں نے کہا "مجھے تو یہ کاہن چند کے دستخط معلوم ہوتے ہیں۔ دکان کا خاص کاغذ ہے۔ اور ——— میرے خیال میں اسے گلوبند بھی مل گیا ہے"۔

"بیشک اسے گلوبند مل گیا ہے۔ جورات چور ———" اسکی آنکھوں میں زہر بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا اور وہ نوشیرواں پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہاں۔ ہاں۔ فرمائیے۔ رُک کیوں گئے؟ آپکی باتیں بہت مزیدار ہیں"۔

لیکن یکلخت رستم جی کے چہرے میں ایک تبدیلی واقع ہوگئی۔ گویا اسکی یاد نے کام دینا شروع کر دیا۔ اس کے مُنہ سے نکلا "آت . . . . تم . . . . تم . . . . "

"ہاں۔ میں . . . . . . کون ہوں؟ یہ ابھی ظاہر ہُوا جاتا ہے۔ آپ ذرا صبر کیجئے۔ ہم یہ دوسرے کاغذات تو دیکھ لیں۔ اب یہ ایک اقرار نامہ ہے جس میں شبول اور جمشید جی کے درمیان کچھ مبلغات یا دوسرے لفظوں میں چہرہ ہائے شاہی کی بابت کارروائی ہے . . . . اور . . . . . . اُفوہ! پچیس فیصدی ماہوار تین سو فیصدی سالانہ۔ آپکی کیا رائے ہے رستم جی صاحب۔ غضب ہے یا نہیں؟ یہ شبول صاحب تو جونک کی طرح خون پی لینا چاہتے ہیں"۔

لیکن دوسرا ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اس نے نوشیرواں کو بالکل پہچان لیا تھا۔ وہ فاتحانہ انداز میں اپنے ہاتھ پتلون کے جیبوں میں ڈال کے ہنسا اور کہنے لگا۔

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ لیکن اُستاد الماس اب یہ بتاؤ کہ اس تمام لوٹ کے مال کو لیکر بھاگ جانیکے لئے آپنے کیا تجویز سوچی ہے؟ میرے خیال میں پولیس کو جسے میں ابھی ٹیلیفون کے ذریعے سے بُلاتا ہوں آپ جیسے قابل دوست کی مُلاقات سے بہت خوشی حاصل ہوگی" اس نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اسکے چہرے کی حالت کو دیکھ کر پھر قہقہہ لگایا۔

اُسکے مُنہ سے قدرے گھبراہٹ کی حالت میں نکلا" نوشیرواں جی صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" رستم جی نے جواب دیا" میرا مطلب یہ ہے کہ نوشیرواں جی صاحب وہ جنس لطیف ہیں جنہیں جنٹلمین چور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انکے کارناموں کی شہرت دُور دُور تک ہے۔ اور پولیس ایک مدت سے گم شدہ بچّے کی طرح انہیں ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار ہوگی"

وہ ٹیلیفون کی طرف چلا اور تارا نہایت خوف زدہ ہوکر نوشیروان کی طرف مخاطب ہوئی" آپ کیوں نہیں کہدیتے کہ یہ سراسر جھوٹ ہے؟"

ایک لمحے کے لئے اس نے لڑکی کی طرف غمزدہ سی مُسکراہٹ سے دیکھا اور پھر میز کے ساتھ سہارا لگا کے کھڑا ہوگیا اور رستم جی سے کہنے لگا" میرے خیال میں اگر آپکی جگہ میں ہوتا تو پولیس کو بلانے میں اس قدر جلدی نہ کرتا۔ مس تارا کو یہ لفافہ بھیجنے والے نے اس میں ایک اور کاغذ بھی بھیجا تھا"

رستم جی نے مُڑ کر دیکھا اور وہیں بے حس و حرکت رہ گیا۔ نوشیرواں نے حسب معمول نہایت ملائمت سے کہا" یہ ایک عجیب سی تحریر ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شبّو ل اپنے اور کاروبار کے علاوہ مال مسروقہ خصوصاً جواہرات میں لین دین بھی کرتا ہے"

بالکل چُپ چاپ دونوں آدمی ایکدوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر نوشیرواں نے دوبارہ گفتگو کو شروع کیا" میں ان کاغذات کو بڑی احتیاط سے رکھونگا تاکہ رستم جی صاحب آپ آئندہ تکلیف دہ نہ ہوسکیں۔ جمشید جی خواہ اپنے قرض کا کچھ حصّہ ادا کریں یا نہ کریں۔ وہ انکا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن یہ میں انہیں ضرور بتا دونگا کہ آپ کیا ہیں اور آپکے کاہن چند اور شبو ل کون حضرات ہیں۔ اسکے بعد اگر گلوبند کے معاملہ میں کوئی کارروائی کیگئی یا کسی کو کانوں کان بھی خبر ہوئی کہ رات کی چوری کا مرتکب الماس

تھا تو یہ کاغذ فوراً پولیس کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگا۔"

رستم جی کے چہرے پر اس گفتگو کے دوران میں ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ نوشیرواں نے اپنے فولادی ہاتھوں سے اسکو دونوں کندھوں سے پکڑ کر ذرا زور سے ہلایا اور کہا "اب تشریف لیجائیے۔ سمجھے؟ آپکو رات کی گاڑی ابھی مل سکتی ہے۔ لیکن میری باتوں کو یاد رکھنا..... اچھی طرح۔"

دوسرے نے دروازے کی طرف رُخ کیا اور اسکے مُنہ سے جلے بُھنے یہ الفاظ نکلے "اچھا الماس اگر تم کسی دن میرے قابو میں آ گئے تو ———"

"تو اس وقت اس معاملے میں مزید بحث کا موقع ہوگا۔ فی الحال" اُس نے دروازے کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا "تشریف لیجائیے۔"

۵

"ہاں۔ یہ بالکل سچ ہے۔" وہ جانتی تھی کہ سچ ہے تاہم اسکے دل میں موہوم سی اُمید باقی تھی کہ شاید کوئی غلط فہمی ہو۔ ممکن ہے کہ اس عقدہ کا کوئی حل نکل آئے۔ لیکن اب جس وقت وہ اس شخص کے ساتھ جس سے اسکو اس قدر لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اکیلی رہ گئی۔ تو وہ موہوم سی اُمید بھی جاتی رہی۔ وہ ہلکی سی مُسکراہٹ سے اسکی طرف دیکھ رہا تھا جس میں اتنا درد اور اندوہ بھرا ہُوا تھا کہ وہ اسے برداشت نہ کر سکتی تھی۔

"میں الماس ہوں۔ وہ الماس جو بقول ہمارے دوست کے تمام ہندوستان میں بدنامی سے نامور ہے میں نے ہی رات شبول کے لوہے کے صندوق کو توڑا۔ میں نے ہی کاہن چند سے گلوبند کی رسید حاصل کی۔ میں شروع ہی میں رستم کے ارادے کو سمجھ گیا تھا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے اندرونی علم ہے۔ رستم جی خود شبول کے کاروبار کا مالک ہے۔ کاہن چند کی دکان میں بھی زیادہ تر اسی کا حِصّہ ہے۔ تمام معاملہ شروع سے ایک ہی مطلب کو پیشِ نظر رکھ کر چلایا گیا تھا۔ جس لڑکی کے لئے جمشید نے گلوبند خریدا تھا وہ بھی اس میں شامل تھی۔ اور اُسی کے ایما پر شبول کے پاس وہ گروی رکھا گیا تھا۔ یہ بات مجھے خود کاہن چند کی زبانی معلوم ہُوئی۔" اس نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ لڑکی کے سامنے ٹھیر گیا۔ اس کی آنکھوں میں محبت بھری ہُوئی تھی۔

"ایک حقیر چور۔ ایک نکمّا آوارہ گنہگار۔ لیکن اُسے بہت ——— نہایت خوشی ہے کہ وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ حسین لڑکی کے کام آ سکا۔ میرے دل کی مالکہ کیوں روتی ہو؟ تمہارا ایک

آنسو بھی اس گنہگار کی تمام ہستی سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس کی گستاخی ـــ اُس بھولی حسین لڑکی سے الفت کا دم بھرنے کی گستاخی کو معاف کر دو۔ بھول جاؤ۔ اُس کا عذر صرف یہی ہے کہ اسے اپنے دل پر اختیار نہ تھا۔ ممکن ہے کہ آنے والے زمانے میں کبھی کبھی اُس لڑکی کو وہ یاد آجایا کرے جسے بعض لوگ نوشیرواں کے نام سے پکارتے تھے۔ بعض الماس کہتے تھے اور وہ خود ـــــ خیر اس ذکر سے کیا فائدہ"

وہ جلدی سے جُھکا اور اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیکر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تارا نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ یہانتک کہ آنسوؤں نے دروازے کو بھی اس کی نگاہ سے چُھپا دیا۔

عطاء الرحمٰن

وقت کی ڈبیہ

نظم بے قافیہ
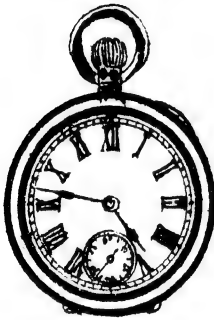
ٹگور کی ایک غیر مطبوعہ بنگالی نظم کا لفظی ترجمہ

اچھی اماں! وقت کی ڈبیہ جو کُھلجائے کہیں
اور یہ گھنٹے اور منٹ سارے نکل کر بھاگ جائیں
تب مجھے مکتب نہ جانے پر بُرا کہنا نہ تم
تب تو مکتب کا نہ ہوگا وقت ہی گویا کبھی

جس قدر گھڑیاں ہیں دنیا بھر میں وہ تو سب کی سب
دیکھو اماں اب جو سونے کے لئے لیٹوں نہ میں
کیسے سوؤں میں نشاں تک بھی نہ ہو جب رات کا
اچھی اماں! آج تو اک بات میری مان لو
تم کہو گی یہ کہانی ختم ہوتی ہی نہیں
دیکھ لینا آج سونے کو نہ ہوگی دیر کچھ

دیکھ لینا دس بجانا ہی نہ جانیں گی کبھی
تم نہ اب مجھ پر خفا ہونا خطا میری نہیں
میری اماں! اب تو راتیں ساری غائب ہوگئیں
بس کہانی پر کہانی مجھ سے تم کہتی رہو۔
ختم ہوجائے کہانی رات جب آگے بڑھے
وقت کی ڈبیہ کے کُھلجانے سے راتیں اُڑ گئیں

حامد اللہ افسر میرٹھی بی اے

کلامِ حسرت

تیری جفا بھی ہے وفا، اے یہ کمالِ دلبری
تیرے ستم سے جیتے ہیں لوگ مثالِ دلبری

بات ہے تیری حیلہ جو۔ صرف بہ نازِ گفتگو
چال ہے تیری فتنہ خو مست بحالِ دلبری

اہلِ کمال کی نظر محوِ ثنا ہے دیکھ کر
چہرۂ حسنِ یار پر ندرتِ خالِ دلبری

مہرِ سپہرِ حسن ہو باخط و خال و گلرخی
ماہِ تمام ناز ہو یا ہو وصالِ دلبری

اس کے سوا کہ ہے یہ تو وصفِ بتاں ہیں ماہرو
کچھ بھی جو جانتا ہو تو کیا ہے مآلِ دلبری

ذات پہ جن کی ختم تھا شیوۂ جورِ برملا
آج ہیں بر سرِ وفا پھر بخیالِ دلبری

میں جو ہوا ہوں چھیڑ سے مائلِ حسنِ دیگرے
طرفہ تری نظر میں ہے شانِ ملالِ دلبری

غش مرے حال دل پہ تھا شورِ جنونِ شوق کا
تیری ادا پہ ہے فدا نازِ جمالِ دلبری

حسرتِ پاک باز کے گریۂ شوق سے رہے
تازہ یونہی خدا کرے! تیرا نہالِ دلبری

(مرسلہ بیگم حسرت موہانی)

نغمۂ زندگی

زندگی کی زندگی ہے اضطرابِ زندگی
ٹوٹ کر بن موجِ مضطر اے حبابِ زندگی

کہہ رہا ہے آفتاب اپنی زبانِ حال سے
منحصر ہے سعیِ پیہم پر شبابِ زندگی

درسگاہِ دہر میں اہلِ بصیرت کے لئے
بہتریں تصنیفِ قدرت ہے کتابِ زندگی

ذرۂ بے نور سے اُٹھتے ہیں شعلے طور کے
ہے یہ تاثیرِ شعاعِ آفتابِ زندگی

تشنگی یونہی بڑھالی انتظارِ خضر میں!
آبِ حیواں تھا نہاں زیرِ سرابِ زندگی

تلخیِ مے ہے دلیلِ کیف جاں پرور امیں
جو ہو کڑوی ہے وہی خالص شرابِ زندگی

ابنِ حزیں

ہمایوں مرحوم

انسان اپنے گرد و پیش کے اثروں سے بے معلوم متاثر ہوتا رہتا ہے۔ ہر انسان کی آبائی خصلتیں اکتسابی خصلتوں سے اثر پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا بھر میں کوئی انسان دوسرے انسان کے بہمہ وجوہ یکساں نہیں نیچر نیرنگی پسند ہے۔ ہر انسان میں نیچر کسی نہ کسی قسم کی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ مورخ کا فرض ہے کہ جب وہ کسی نامور شخص کی حالت لکھے تو اسکو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کونسی حالت تھی جن کی وجہ سے اُس شخص میں بُری یا نیک خصلتیں پیدا ہوئیں +

آنریبل سَر جسٹس شاہ دین صاحب ہمایوں کے بعض اوصاف حمیدہ کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ انکا سراپا ذیل کی عبارت سے ادا ہوجاتا ہے اسکی تفصیل ہم بعد میں تحریر کرینگے:۔

نیک معاش۔ کفایت شعار۔ ناثر و ناظم۔ حبیب قوم۔ آزاد خیال۔ قدرے ظریف طبع۔ کچھ رنگین مزاج قانون دان۔ خود دار۔ قدر شناس +

ایک زراعت پیشہ قوم کے شخص کو جس کے بزرگ تعلیم ادبی سے معرا نہ رہے ہوں آپ اچھی آب و ہوا میں نشو و نما کا موقعہ دیجئے اُسے دیسی اور انگریزی زبانوں میں تعلیم دیجائے۔ اُسے شہری زندگی سے علیحدہ رکھا جائے۔ آس پاس اُسکے باغات ہوں اگر نیچر نے اسکو طبع موزوں عطا کی ہے تو وہ رنگین مزاج ہو جائیگا۔ اُسکو آپ محبان قوم کی تصانیف پڑھنے کو دیدیجئے اُسکے دل میں امنگ پیدا ہوگی کہ میں خود بھی بڑھوں اور اپنی قوم کو بھی اُبھاروں۔ بُری صحبت سے اُسے بچائیے وہ نیک چلن رہیگا اور نیک معاش نکلیگا اُسکی طبیعت میں اگر منطق کی میزان صحیح ہے تو اسکے خیالات اوہام باطل کو دفع کرتے رہینگے آزاد خیال ہو جائیگا اگر اُسکو تلاش روزگار میں خوشامد کے مواقع نہ ملینگے تو خودداری اُس میں پیدا ہو جائیگی۔ اگر اُس کا مطالعہ وسیع ہوگا تو وہ قدر شناس بن جائیگا۔ اگر اُسکو صحبت طبیعت دار لوگوں کی ملیگی تو ظرافت کی چاشنی آجائیگی۔ اگر قانون کے مطالعہ کی جانب اُسکو رجوع کیجئے گا تو اگر اسکی طبیعت ذہین ہے قانونی اصولوں کو بہت جلد ذہن نشین کرلیگا +

ہمایوں ممدوح زراعت پیشہ قوم سے تھے لیکن اُنکے بزرگوں میں سے بعض صاحب علم بھی تھے

وہ شالامار اور دیگر متصلہ باغات کے نواح میں ایک گاؤں باغبانپورہ میں پیدا ہوئے وہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم پائی۔ انگریزی کی تعلیم بی اے تک حاصل کی صحبت اچھے آدمیوں سے رہی ولایت میں بیرسٹری کے لئے گئے وہاں سے آکر مصروف مطالعہ رہے اور فن وکالت میں نام پیدا کیا۔ اگر وہ ہربرٹ سپنسر کی تصانیف کے شائق نہ ہوتے اگر وہ سر سید۔ حالی۔ شبلی۔ محسن الملک جیسے محبان قوم کی تصانیف نہ پڑھتے تو وہ شاعر ہوتے نہ فصیح ہوتے نہ حبیب قوم ہوتے نہ وہ منطق کی میزان سے آشنا ہوتے نہ وہ آزاد خیال ہوتے اگر وہ ولایت کی رہایش[1] سے محروم رہتے تو انگریزی کے ایسے بلیغ ماہر اور قانون کے ایسے عالم نہ ہوتے۔ اگر اگر وہ شہری زندگی بسر کرتے تو ثقاہت اور متانت سے محروم رہ کر طبیعت کے عیش پسند فضول خرچ اور نمودی ہوجانے کا خوف تھا۔ آس پاس انکے نیچر کے مناظر اُن کی طبیعت کو شاعری کی جانب راغب کرتے رہتے تھے۔ حالی کی شاعری کا رنگ چڑھتا جاتا تھا۔ اگر وہ چیفکورٹ کے بنچ پر نہ بٹھائے جاتے تو قانون کی تعبیر کا موقع نہ ملتا۔ اگر وہ حُبِ قوم میں شرابور نہ ہوتے تو کانفرنسوں میں انکے قلم سے ایسے فصیح و بلیغ مضامین نہ نکلتے۔ اگر وہ خوشامد کے مواقع سے معرا نہ رہتے تو خودداری اُن میں پیدا نہ ہوتی اگر وہ خود جوہر علم سے مزین نہ ہوتے تو کسی اہل علم و فضل سے مانوس نہ ہوتے نہ انکی قدر کرتے۔ اگر راستبازی کا سہارا انکی طبیعت میں نہ ہوتا تو ان میں اتنا حوصلہ نہ ہوتا۔ کیونکہ عیبی شخص ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ تہذیب حال کی ترغیبیں۔ بناؤ چناؤ۔ زمانہ سازی تصنع۔ تکلف کی دلفریب کششیں انکا مضبوط دل پسپا کرتا رہتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ انسان کی قدر اُس کے مرے بعد ہوتی ہے۔ اب محسوس ہونے لگا ہے۔ کہ وہ بے وقت راہئی ملکِ بقا ہوئے اور پنجاب ابھی اُن کی کمی پوری نہیں کرسکا۔

شمیم

---

[1] نواب عماد الملک بالقابہٗ "رہایش" کو اُردو کی دنیا سے بارہ پتھر باہر کرنا چاہتے ہیں۔ میری رائے ناقص میں یہ عام طور پر استعمال ہونے کی وجہ سے اب اِس سزا کا مستحق نہیں رہا ہے۔" تاجور

نپولین مصر و شام میں

"مشرق زبردست سلطنتوں کا تماشہ گاہ ہے جہاں دنیا کے بڑے بڑے انقلاب واقع ہوئے۔ جہاں عقل پیدا ہوئی جو دنیا کے مذہبوں کا گہوارہ ہے اور جہاں اب بھی ساٹھ کروڑ آدمی رہتے ہیں"۔

یہ تھے نپولین کے لفظ جن سے اُسکے ولولوں اور منصوبوں کا پتہ چلتا ہے۔ اُس کے جی میں آتا تھا کہ وہ اُس سرزمین کا فاتح و حاکم بنے جو وسیع سلطنتوں اور سب سے قدیم تہذیبوں کی جنم بھوم ہے اس سرچشمہ سے اپنی علمی آرزؤں کی پیاس بجھائے جو پرانے داناؤں کے فیض سے جاری ہوا۔ اُن دُور دراز ملکوں کا انتظام و اصلاح کرنیوالا ہو جو صدیاں ہوئیں نبیوں اور ولیوں کے جلوؤں سے پُرنور تھے لیکن اب جہالت اور بُری رسموں کے گھُپ اندھیرے میں چھُپ کر دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

فاتح اطالیہ کے لئے پیرس ایک تنگ و تاریک مقام تھا جہاں عظمت کے لئے کوئی راستہ کھلا نہ تھا اُس نے بورئین سے کہا "پیرس والے بھول بھول جاتے ہیں۔ اگر میں یہاں کچھ دیر اور مقیم رہوں تو نکما بن کر ملیا میٹ ہو جاؤں۔ پیرس یورپ کا بابل ہے۔ یہاں ہر شئے کو گھن لگ جاتا ہے۔ میری ناموری بھی غائب ہو چکی ہے یورپ کی تنگ زمین میری شہرت کے لئے کافی گنجائش نہیں رکھتی۔ لازم ہے کہ میں اُس کی تلاش مشرق میں کروں کہ ہر قسم کی ممتاز ناموری وہیں سے ملتی ہے۔ لیکن اس سے قبل میں چاہتا ہوں۔ کہ شمالی ساحل کا معائنہ کروں اور ممکن باتوں پر غور و خوض کی نظر ڈالوں۔ اگر جیسا کہ میرا خیال ہے انگلستان کی یورش میں کامرانی کے آثار نظر نہ آئیں تو "فوجِ انگلستان" "فوجِ مشرق" بن جائے گی اور میں مصر کا رُخ کرونگا"۔

فتحِ اطالیہ کے بعد جب یورپ کے تاجدار فرانسیسی فتوحات کے کارناموں سے خوف کھا کر جنگ سے ہاتھ اُٹھا چکے تھے تو "ناظمین" فرانس نے فتحِ انگلستان کا منصوبہ باندھا۔ وہ متمول ملک اپنی نو آبادیوں اور اپنے بیڑے کے ساتھ طاقتور ہونے کے علاوہ فرانس میں شاہ پسندوں کو اُکسانے والا یورپی اتحادوں کی قوت کو اپنے سیم و زر سے تر و تازہ رکھنے والا اور سمندروں پر مار دھاڑ کرنے والا غنیم تھا

نوٹ:- دو سال ہوئے میں نے نپولین کے حالات زندگی لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ صرف چند باب لکھے جا سکے یہ باب بھی اُسی زمانے کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں اسکی زندگی کے اس حصے سے تعلق ہے جب وہ اطالیہ کو فتح کرکے مشرق میں شہرت حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔

نپولین کا قول تھا کہ "اگر ہماری حکومت انگریزی شخصی سلطنت کو تباہ نہ کر سکیگی تو خود ان شاہ پسندوں کے ہاتھوں برباد ہو جائیگی۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی ساری قوت اپنے بیڑے کی تقویت پر صرف کر دیں اور انگلستان کو قطعی طور پر ملیامیٹ کر دیں یہ ہو گیا تو یورپ ہمارے قدموں میں ہو گا"۔

فروری ۱۷۹۸ء میں نپولین ڈنکرک گیا اور قلندری ساحل کا معائنہ کر کے اہلِ حکومت کو لکھا کہ بغیر بحری برتری کے انگلستان پر حملہ کرنا ایک غیر معمولی دشواری اور بیباکی کا کام ہے اور اگر ہماری بحری قوت ترقی نہیں پا سکتی تو ہمیں اس حملے کے خالی دکھلاوے پر مطمئن رہ کر دریائے رائین پر اپنی فوجوں کو جمع کرنا چاہیئے تاکہ ہم انگلستان کے جرمن مقبوضات کو اپنے قابو میں لیں اور ہمیں ایک ایسی یلغار کی تیاری کرنی چاہیئے جس سے انگلستان کی ہندی تجارت کو نقصان پہنچے۔ اس آخری تجویز پر اس نے اپنی ساری توجہ اور توانائی صرف کر دی مصر کی فتح اور ہندوستان میں فرانس کے کھوئے ہوئے مقبوضات کی بحالی عملی اور خیالی دونوں پہلوؤں سے نپولین کے لئے نتیجہ خیز اور دلکش تھی۔ قاہرہ میں جامع ازہر کے میناروں اور دہلی میں لال قلعے کی فصیلوں پر فرانسیسی جھنڈے کو لہراتے ہوئے دیکھنے کا خیال اسکے دل میں چٹکیاں لیتا تھا۔ عملی قوت زوروں پر تھی اور تخیل مصروف پرواز۔ مشرق پُر راز سرزمین ہے اور وہ خود اک پُر راز ہستی بننے کا آرزومند۔ اور فرانس کی ساری قوت اسکی پشت پر ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتا ہے کہ "یورپ تو ہماری مٹھی میں ہے اور ہم جس طرح چاہیں گے اُسے اس سانچے میں ڈھال لیں گے۔ اگر قسمت کو منظور ہے تو میں اسے ناممکن نہیں سمجھتا کہ چند برسوں میں ہم اُن حیرت انگیز نتیجوں پر پہنچ جائیں جن کی صرف ایک جھلک پُر جوش تخیل کو نظر آتی ہے لیکن جن کا پورا ہونا صرف ایک غایت درجہ سرد طبع مستقل مزاج اور اندازہ دان شخص کے ہاتھوں ہو سکتا ہے۔ فرانس کو "بڑی قوم" بنانا اُس کا نصب العین تھا اور اس کمال کا پیش خیمہ مشرق کی فتح تھی۔

"فوجِ مصر" کے انتظام و قیام کے لئے روپیہ پیسہ درکار تھا اور یہ حکومتِ فرانس نہ رکھتی تھی سو اس کے لئے شہر روما اور سوئٹزرلینڈ میں "مہذب دخل" کے ذریعے سے خراج کا تحفہ حاصل کیا گیا۔ روما میں پوپ کو برطرف کر کے جنرل برتیئے نے جمہوریۂ روما کی بحالی کا اعلان کیا اور نپولین کو لکھا کہ آپ نے مجھے روما کی طرف بھیج کر مہمِ انگلستان کا امین مقرر کر دیا ہے۔ میں خزانۂ فرانس کو مالا مال رکھنے کی پوری کوشش کرونگا۔

جون ۱۷۹۸ء میں نپولین کے بیڑے نے طولون کی بندرگاہ میں اپنا لنگر اٹھایا۔ تین سو

مسافری جہازوں میں پینتیس ہزار فوج تھی اور تیرہ بڑے اور کئی چھوٹے جنگی جہاز حفاظت کے لئے ساتھ تھے لیکن حفاظت برائے نام تھی۔ اگر نپولین اسکندریہ میں تین روز پہلے پہنچتا تو اُس کی جمعیت بدقسمتی سے انگریزی امیرالبحر نلسن کے نرغے میں آجاتی اور اُس کی منصوبہ بازیوں کا یقینی طور پر خاتمہ ہوگیا ہوتا لیکن قسمت ہی تو تھی جس کا لاڈلا بچہ بن کر وہ بیباکی کے ساتھ بڑے بڑے خطرناک کاموں پر اپنا ہاتھ ڈال لیا کرتا تھا +
اس بات پر مورخوں اور سیرت نگاروں کا سخت اختلاف ہے کہ کیا نپولین توہمات کا ماننے والا تھا۔ یا نہیں ؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے ستارۂ قسمت پر اعتقاد ظاہر کرتا تھا۔ اور اگرچہ بعض مورخین کو پورا یقین ہے کہ یہ فقط عام لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کا اک طریقہ تھا اس لئے کہ اس کا ذکر صرف نپولین کے اعلانوں اور تقریروں میں پایا جاتا ہے جس سے مُراد لوگوں پر اثر ڈالنا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بغیر کسی ایسے اعتقاد کے اُس کا اپنی خوش نصیبی پر اعتقاد کر کے ہمیشہ نہایت خطرناک اور تقریباً ناحاصل ہو سکنے والی کامیابیوں کے پیچھے دوڑتے پھرنا بھی نہایت غیر اغلب ہے وہ اپنے آپکو قسمت کا لاڈلا بچہ سمجھتا تھا اور اُس کا عمل برابر اسی خیال پر مبنی تھا کہ مجھے قدرت نے ہمیشہ کی کامیابی کا تمغہ عنایت کیا ہے اور مجھے اپنے ارادے سے ٹلنا کبھی نہ چاہیئے +

جزیرۂ مالٹا رستے میں پڑتا تھا۔ جاتے جاتے اُسے بھی فرانسیسی قلمرو میں شامل کر لینے کا خیال پیدا ہُوا یہ جزیرہ جس پر سینٹ جان کے جانفروشوں کی حکومت تھی۔ عنقریب رُوس کے پنجے میں آنے کو تھا کہ نپولین نے اُس پر قبضہ کر لیا + یہاں کا قلعہ یورپ کے سب سے زیادہ مضبوط مقامات میں شمار کیا جاتا تھا لیکن اُس کی فتح ایسی آسانی سے ہُوئی کہ ایک فرانسیسی جنرل نے قلعوں فصیلوں کا معائنہ کرتے ہُوئے نپولین سے کہا "واللہ! جنرل! کیسی خوش قسمتی تھی کہ شہر میں کچھ لوگ ہمارے لئے دروازہ کھولنے کو موجود تھے"۔ سات روز کے قیام میں نپولین نے مالٹا کی کایا پلٹ دی + "جانفروشوں" کی دقیانوسی جمعیت کو منسوخ کر کے اُس نے فوجی گورنر کے تحت میں ایک حکومت قائم کی اور نئے محصول لگا کر گلی کوچوں کی خوبصورتی فواروں کی تعمیر اور شفاخانوں اور ڈاکخانوں کے اجرا کی بنیاد ڈالی۔ دارالعلوم کی ترقی و توسیع خاص توجہ کی اور ہر محکمے میں اپنی امتیازی قابلیت کی مُہریں لگادیں + دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اُس نے مالٹا کو قرونِ وسطیٰ کی تاریکی سے نکال کر زمانۂ موجودہ کی روشنی میں جگہ دی اور ملک و اہلِ ملک کو موجودہ تمدن کی روش پر ترقی کے رستے لگا دیا +

یہ کام کرکے اُس نے اپنے جہازوں کے لنگر اُٹھائے اور سیدھا اسکندریہ کا رُخ کیا۔ ان بحری سفر کے دنوں میں اُس کا وقت طرح طرح کی دلچسپیوں میں گذرا۔ اُس کے ساتھ ایک مختصر سا کتب خانہ تھا جس میں تاریخ اور سوانح عمری کی کتابیں خاص طور پر نمایاں تھیں۔ پرانی دنیا سے یُونان و روما کے مورخین کی شہرہ آفاق تاریخیں موجود تھیں۔ زمانۂ موجودہ کی تصنیفات میں قوموں کے ادارات اور عادات و اطوار کی طرف توجہ تھی۔ شاعروں میں ہومر ورجل ادسیاں وغیرہ تھے۔ افسانوں میں انگریزی زبان کے چالیس ناول تھے۔ فنونِ لطیفہ اور طبیعات کی چند کتابوں کے علاوہ بارکلے کا "جغرافیہ" اور کک کا سفرنامہ تھا لیکن سب سے دلچسپ امر یہ ہے کہ سیاست کے عنوان کے نیچے اُس نے انجیل قرآن وید افسانیات۔ اور موں تسکیو کی تصنیف "رُوح قوانین" شامل کرلی تھیں۔ یہ انتخاب و ترتیب بے معنی نہ تھا۔ یونانی افسانوں سے وہ اپنے اعلانوں کو عبارت کرتا تھا۔ قرآن مجید کے ذریعے سے مسلمانوں کو قابو میں لانا مقصود تھا اور انجیل مقدس دروسیوں اور ارمنیوں کی کنجی تھی۔ یہ تسخیرِ قلوب کی چابیاں جو اُسکے پہلو سے لٹکتی تھیں ضرورت کے وقت کام آسکتی تھیں۔ ان لوگوں کے قابو میں لانے کا اس سے زیادہ کونسا نسخہ کارگر ہوسکتا تھا۔ مذہب سے وہ کچھ ایسی ہی خدمت لینا چاہتا تھا لیکن اُس کی زندگی اس کے ساتھ ہی کئی ایسے واقعات سے بھی معمور ہے جن کی کرنیں ہمارے لئے اُس کے چھپے ہُوئے خیالات کو ظاہر کردیتی ہیں اور ہمیں اُس شخصیت سے دو چار کردیتی ہیں جس کا نام نپولین تھا۔ اُس کے جہاز "اوریاں" (مشرق) پر عالم فاضل لوگوں کا ایک مجمع تھا جو مصر کے چھپے خزانوں کو کھود نکالنے اور مغربی معلومات کو وسعت دینے کے لئے اُسکے ساتھ شریکِ سفر تھے۔ اُن کی علمی بحثوں میں جو منطق و دانش کے معرکے تھے وہ اکثر خود شامل ہوجاتا۔ ایک رات خدا کی ہستی پر بحث ہو رہی تھی اور فریقین اپنی اپنی معقولیت کے مُنہ زور اور شب کور گھوڑوں پر سوار ہوکر دیکھتے دکھاتے تھے کہ کون اس علمی لفاظی و طراری میں سبقت لیجاتا ہے کہ نپولین نے جو موجود تھا تاریک آسمان کی طرف ٹمٹماتے ہُوئے تاروں کو دیکھا اور کہا "سب کچھ درست صاحبان! لیکن وہ سب کچھ کس نے بنایا؟"

ایسی ہی باتوں گھاتوں میں یہ خطرناک سفر کٹ گیا۔ اور ۲ر جولائی ۱۷۹۸ء کو نپولین نے اپنی فوج اسکندریہ کے قریب اُتاری اور ایک ہلے میں شہر مار لیا۔ انگریزی مورخ روز لکھتا ہے کہ فرانیسیوں کو لازم تھا کہ مصر کے حملے کے لئے کوئی معقول وجہ جنگ تلاش کریں۔ سو اُن کے سپہ سالار نے

ترکوں کو سمجھا بجھا کر دوستی کا اظہار کیا کہ مصر کے سلطان روم و خلیفۃ المسلمین کے خلاف اپنی طاقت کو بڑھا
کر ڈیڑھ اینٹ کی اک جدا مسجد کھڑی کر رہے ہیں۔ میں اُن کو سزا دینے کے لئے آیا ہوں۔ ہمارا منصف مزاج
مورخ اکثر بھول بھول جاتا ہے کہ موجودہ مہذب قوموں کو سوائے اِن چالوں کے دوسری طرز و جہ جنگ
ترانشنے کی آتی ہی نہیں اگر وہ حال کی مغربی فتوحات پر نظر ڈالیگا تو اُس پر روشن ہو جائیگا کہ یہی سب سے زیادہ مہذب
طریقہ ملکوں کو قابو میں لانے کا ہے جس پر رُوس فرانس اطالیہ انگلستان وغیرہ عمل کرتے آئے ہیں۔ نپولین
بھی یورپ کی تھیلی کا ایک بٹہ تھا دوسروں سے ذرا زیادہ سخت۔ اُس نے مصر میں قدم رکھتے ہی
اِدھر ترکوں کو بہلائے رکھنا چاہا اُدھر مُراد اور ابراہیم بے کے باہمی حسد اور اختلاف سے فائدہ اُٹھا کر اہلِ حکومت
کو آپس میں لڑوا دیا۔ لوگوں کو فریب دینے کے لئے اُس نے اپنے سپاہیوں کو حُکم دیا کہ یہودیوں اور اطالویوں کی
طرح مسلمانوں کے حقوق کی بھی پاسداری کرو اور اعلان عام میں کہا کہ "کیا ہم نے پاپائے روما کو جس نے
عیسائیوں کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے اُکسایا تھا تباہ نہیں کر دیا؟ کیا ہم نے مالٹا کے جانفروشوں
کو ملیا میٹ نہیں کر دیا جو اسی میں خدا کی خوشنودی سمجھتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جہاد کیا کریں"۔ فرانسیسی
سپاہی اپنے سپہ سالار کی ہر چال تاڑتے تھے اور جی ہی جی میں خوش ہوتے تھے۔ لیکن اُن کی آزمائش کا وقت بھی
آ رہا تھا۔ ۴ر جولائی کی شب کو ایک حصہ فوج نے جنوب کی طرف قاہرہ کو کوچ کیا۔ مُلک اجنبی تھا۔
ہر شئے نئی اور ڈراؤنی تھی۔ جنگجو اپنے سالار کے حکم پر نہیں معلوم کہاں جا رہے تھے اور کیوں؟ سُورج نکلا تو
اُس کی گرما گرم کرنوں نے پیٹھ لال کر دی۔ سرد ملکوں کے رہنے والے تھے شور مچانا شروع کر دیا کہ کیا یہی وہ
سرزمین ہے جو لومبارڈی سے زیادہ زرخیز ہے؟ جہاز پر سے اسکندریہ کے صحرا کو دیکھ کر ایک سپاہی نے
دوسرے سے کہا "دیکھو یہ ہے وہ چھ ایکڑ زمین جو تمہارے حصے میں آئیگی"۔ جب صحرا میں پہنچے تو آنکھیں کھل گئیں
کہ مصر کیسا مُلک ہے اور اس کا فتح کرنا کتنا دشوار۔ (نپولین نے قاہرہ کو قریب کا رستہ اختیار کیا تھا) پہلو سے اور
پیچھے کی طرف بدوؤں کے ڈاکے پڑتے تھے اور کبھی کبھی بیابانی بچھو بھی خاطر تواضع کرتے تھے۔ بیابان
میں پانی پہلے ہی کم ملتا تھا۔ عربوں نے رہے سہے کنوؤں کو بھی اینٹ روڑوں سے بھر دیا۔ پیاس کی شدت
اور پانی کی کمی کا یہ حال تھا کہ پانی کا ایک کٹورا اتنے ہی وزن کے سونے کے عوض بکتا تھا۔ لیکن نپولین ذرا
نہ جھجکا۔ اُس کا سخت و سنجیدہ چہرہ سپاہیوں کے رویے سے ذرا نہ بدلا اور جب اُس نے ایک طرف سے
یہ فقرا سُنا کہ "اچھا! جنرل! کیا تم ہمکو ایسے ہی ہندوستان لئے جاؤ گے؟" تو اُس نے ڈپٹ کے جواب دیا

"...تم جیسے سپاہیوں کے ساتھ ایسا بڑا کام کرنے میں کیوں چلا؟" اپنے سپہ سالار کی حیرت انگیز عملی قوت پر بھروسہ کرکے اُنھوں نے باقی رستہ ہنسی مخول میں کاٹ دیا۔ لٹیرے بدوؤں کا نام اُنھوں نے "شاہراہ کی سوار پولیس" رکھا۔

بمقام شبرّیس آٹھ سَو مملوکوں کو شکست دیتے ہُوئے فرانسیسی فوج قاہرہ کے سامنے پہنچی۔ وہاں مراد بے نے مملوکوں کی بہادر سوار فوج کو آراستہ کیا تھا۔ مدتوں کے بعد مشرق و مغرب گتھم گتھا ہونیکو تھے دنیائے اسلام جو صدیوں سے اپنے عیش و عشرت میں غرق ہوکر اپنی عظمت کی سب پرانی خوبیاں کھو چکی تھی اک نئے تمدن کے ساتھ ٹکرا کر اپنی کمزوریوں سے آشنا ہُوئی۔ دونوں فوجوں کی نظروں کے سامنے دریائے نیل اپنی مستی میں بہہ رہا تھا۔ اُدھر قاہرہ کی مسجدوں کے نازک پُرانکسار مینار دکھائی دیتے تھے اور دُور جنوب کی طرف اہرام مصر اپنی شوکت کے ساتھ قائم تھے۔ فرانسیسوں کی حالت نازک تھی۔ اپنے مُلک سے ہزاروں میل کی مسافت پر تپتے ہُوئے صحراؤں سے گذر کر یہ لوگ ایک اجنبی غیر مذہب رکھنے والی قوم سے اُن کے دارالسلطنت کے پاس ہی جنگ کرنے کو تھے۔ تعداد میں کم ہوں تو کمک نہیں اور بھاگ پڑے تو جائے پناہ نہیں۔ اُدھر وہ صحرائی جنگ میں طاق شہادت کے مشتاق گھر بار نزدیک توشہ خانہ قریب اور سلاح خانہ موجود۔ لیکن اِدھر نپولین کی سب کچھ سمجھنے والی جنگی قابلیت تھی جس سے مُراد بے کی مقامی مشاقی کو واسطہ پڑا تھا۔ ویلنگٹن کا نپولین کو چالیس ہزار سپاہیوں کے برابر سمجھنا صرف ایک فرضی قصہ نہ تھا: ؎

جم جائے جہاں کوہ وہاں کاہ سے کیا ہو　　جب شیر کو غیظ آئے تو روباہ سے کیا ہو!

فوج کی دلاوری جانبازی کا کیا ٹھیک تھا جب "اہرام مصر" کی طرف اشارہ کرکے نپولین للکارا کہ "جوانمردو! چالیس صدیاں تمہیں دیکھ رہی ہیں"۔ یہ سمجھئے کہ گویا غیب کی اک ندا تھی یا اک بڑی بھاری کمک کا خلافِ اُمید میدان میں آپہنچنا تھا جس نے لڑائی کی کایا پلٹ دی۔ فرانسیسی صفیں باندھ کر مصریوں کی خندق میں جمی ہُوئی فوج کی طرف بڑھے۔ "میسرے" کے دستوں نے فوراً خندقوں کو سر کرلیا غنیم کی کمزور توپوں کو خاموش کرکے توپچیوں کو قتل کیا۔ اُدھر دوسرے دستوں پر جو مربع صورت صفوں میں جم کر کھڑے تھے دس ہزار مصری سوار آن پڑے اور مربعوں کا اگلا حصّہ کاٹ کر صفوں کے درمیان میں گھُس گئے مگر آتشباری کی سخت بوچھاڑ سے مغلوب ہوکر اپنے سینکڑوں منچلے سپاہی زخمی اور مردہ چھوڑ کر پلٹے اور فرانسیسوں کی پیشقدمی پر بہت جگہ پسپا ہوکر تتر بتر ہو گئے۔ یہ بھی جنگ اہرام

جس میں فرانسیسی بیان کے مطابق نپولین کے تیس آدمی مارے گئے اور تقریباً تین سو زخمی اور اس تھوڑے سے نقصان کے ساتھ ایک مُلک کا مُلک مار لیا۔

ابراہیم بے مشرق کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ نپولین نے اُس کا پیچھا کیا اور اُسے شام کی طرف بھگا دیا۔ ادھر مصر بالا میں جنرل دیز لے مُراد پر فتحیں پاتا رہا۔ لیکن وطن سے ہزاروں کوس دُور ایک صحرائی ملک میں اس قسم کی فتوحات حاصل کرتے پھرنا بہت فائدہ مند نہ تھا۔ نپولین نے انہیں دنوں میں سُنا کہ نلسن نے اُس کا سارا بیڑا تباہ کر دیا۔ اُس نے اپنے امیر البحر بردائر کو حکم دیا تھا کہ وہ جزیرہ کورفو یا ابوکیر کی محفوظ بندرگاہ میں اپنا بیڑا لے جائے۔ امیر البحر کا خیال تھا کہ بھاگ کر کورفو میں پناہ لینا بزدلی ہے۔ وہ خلیج ابوکیر میں جا ٹھیرا جہاں نلسن نے یکم اگست کو اُس پر چھاپہ مارا اور سوائے دو چار جہازوں کے سارے بیڑے کو تباہ کر دیا۔ اس تباہی کی خبر نپولین پر بجلی کی طرح گری۔ اُس نے جان لیا کہ وہ ایک فتح کئے ہُوئے ملک میں گھر گیا ہے لیکن اس تنگی کے حال میں بھی اپنی فوج کو ہمت دلانے کے لئے اُس نے کہا "خیر! اب اسکے سوا چارہ نہیں کہ ہم یہیں پڑے رہیں یا پُرانے سُورماؤں کی طرح سچی عظمت حاصل کریں"۔ بڑے بڑے افسروں تک کے حوصلے پست ہو گئے اور اکثر چوں و چرا کرنے لگے لیکن سپہ سالار نے جو خود فوج کی سلامتی کا ذمہ دار تھا اور بڑی سے بڑی مشکل میں ہمت نہ ہارتا تھا ان گلوں شکووں کا مُنہ خاک سے بھر دیا جنرل دوماسے جو ایک قوی ہیکل چوڑا چکلا جوان تھا اُس نے کہا "یاد رکھو! تم ناوفاداری کی باتیں کرتے رہتے ہو ایسا نہ ہو کہ میں اپنا فرض ادا کر بیٹھوں۔ تمہارا چھ فٹ لمبا جسم تمہیں گولی سے مار دیئے جانے سے بچا نہیں سکیگا"۔ چند ہمت ہارے ہُوئے افسروں کو اُس نے فرانس واپس چلے جانیکی اجازت دیدی کیونکہ وہ نلسن کی فتح کے بعد نکمّے ہو گئے تھے۔ باقیماندوں کو جمع کرکے اُس نے یہ پُرتخیل خوددارانہ لفظ کہے کہ "اگر طوفان نے ہمکو آ لیا ہے تو ان پانیوں میں ہمیں اپنا سر بالا بالا رکھنا چاہیئے۔ پھر طوفان خود ہی کم ہو جائیگا۔ شاید ہماری قسمت میں لکھا ہو کہ ہم مشرق کی کایا پلٹ دیں اور اُن ناموروں کے ساتھ صفحۂ تاریخ پر اپنا نام لکھ دیں جنہوں نے پُرانے زمانوں میں دُنیا کی بستی میں اپنے کارناموں کی بیمثال یادگاریں چھوڑی ہیں"۔

نپولین کی طبیعت کی ذکاوت کبھی ایسی نمایاں طرح ظاہر نہیں ہُوئی جیسی اس مایوسی و ناکامی کے وقت میں، جب اس نے دیکھا کہ وہ وطن سے کوسوں دُور ایک اجنبی صحرا میں انگریزی بیڑے سے

گھِر گیا ہے تو اُس نے اپنے حکما و علما کو اپنے گرد جمع کیا اور مصر میں سامانِ تہذیب و ترقی کے جمع کرنے اور وہاں کے قدرتی وسائل کے بہم پہنچانے میں اپنی حیرت انگیز جدت طرازی کا ثبوت دیا۔ گیہوں اور چاول کی کاشت بڑھا کر غلّے کی قلّت کا انتظام کیا۔ بعضوں نے ولایتی تنور بنائے بعضوں نے ہوا چکیاں چلائیں۔ عمدہ دیسی شراب بنانے کے لئے بنجر زمینوں کو انگورستان میں تبدیل کیا۔ کارخانے اور سلاح خانے قائم کئے جن سے آہستہ آہستہ لڑائی کا سامان تیار ہونے لگا۔ ساتھ ہی شورے کے کارخانوں میں فرانسیسی فوج کے لئے بارود بننے لگا + ہفتے میں کئی بار نپولین خود معمل کیمیادی میں آکر تجربات کا مشاہدہ کیا کرتا۔ اُس نے ۲۳ اگست ۱۷۹۸ء کو دائرۂ مصر (انسٹیٹوٹ) کے نام سے ایک بے کے محل میں اک علمی مجلس قائم کی جس کا کام اکتشافات و ایجادات سے تعلق رکھتا تھا۔ مصرِ بالا کی فتوحات نے مغربی دُنیا کے سامنے ممفس کے شاندار کھنڈرات کا منظر کھولدیا۔ ان میں سے بہت سے عجائبات جو پیرس کے لئے اکٹھے کئے گئے تھے انگلستان کی بحری قوت نے عجائب خانۂ برطانیہ میں لاجمع کئے۔ فلکیات کو جنرل کافاریلی نے اپنے مشاہدات سے ترقی دی۔ مصر کی زمینی پیمائش شروع کی گئی۔ ماہرانِ تجربات" نے دریائے نیل کی تہ زمینی کا معائنہ کرکے اُس کے دہانے کی قدامت کا اندازہ کیا + غرض یورپ کے "علمِ مصریات" بنیادی پتھر نپولین کی انہیں علمی کوششوں کے ساتھ رکھا گیا جن پر اُس کا اپنا قول کا صادق آتا ہے کہ سچی فتوحات ایسی جن کا نتیجہ کبھی ندامت نہیں ہوتا وہی ہیں جو ملک جہالت کے سر کرنے میں حاصل ہوں"

مصر کی سیاسی حالت کی طرف بھی اُس نے توجہ کی + ملکی معاملات میں وہ مصریوں کی ایک مجلس سے مشورہ لیتا تھا قاہرہ میں داخل ہوتے ہی اُس نے شہر کے انتظام کے لئے ایک دیوان مرتب کیا جس میں نو شیخ تھے۔ ملک کے لئے ایک اور بڑا دیوان اور ہر صوبے کے لئے ایک چھوٹی مجلس شوریٰ بنی جو عدل گستری اور محصولات کی بہم رسانی میں مدد دیتی تھی + ایک ٹکسال قائم ہوئی اور ایک فرانسیسی تجارتی کمپنی کی بنیاد بھی ڈالی گئی۔

اُس کے عقل و فہم کا خزانہ ان ایجادوں پر ختم نہ ہوا + سویز کی طرف جاتے ہوئے ایک روز اُس نے صحرا میں ایک کارواں دیکھا۔ اونٹوں کی تیزی کو دیکھ کر اُس پر اس درجہ اثر ہوا

کہ جنوری ۱۷۹۸ء میں اُس نے بھی اونٹوں کا ایک رسالہ بنایا جس میں داخل کیا جانا فرانسیسی قدر اور رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور بہت جلد اس معاملہ فہم سپہ سالار نے بدوؤں سے اُنکے صحرائی گھر میں اپنی توت و قابلیت کا لوہا منوا لیا۔ سپاہیوں کی تفریح کے واسطے نپولین نے اہرامِ مصر کے قریب باغاتِ تیوولی کے آراستہ کرنیکا حکم دیا جہاں ان فتحمند غریب الوطنوں نے پیرس کے نمونے پر عشرت گاہیں قائم کیں۔ کہتے ہیں کہ خود سپہ سالار بھی اپنے ایک افسر کی زوجہ کا دلدادہ ہو گیا جو غالباً یوزفین کی بیوفائی و بے رُخی کا نتیجہ تھا۔ عید میلاد کی تقریب پر وہ شیخ البقری کے مکان پر گیا جہاں آنحضرتؐ کی پاک سیرت کے حالات کو سُن سُن کر سینکڑوں لوگ وجد میں آ رہے تھے۔ وہاں پہلی بار نپولین ایشیائی طریق میں لوگوں کے ساتھ شریکِ دعوت ہوا۔ مسلمانوں کو دم دینے کے لئے اُسکے حکم سے ایک ایسی عالیشان مسجد کا نقشہ تیار کیا گیا جس میں ساری فرانسیسی فوج صفیں باندھ کر نماز ادا کر سکے۔ ایک موقع پر اُس نے اپنے افسروں کے دل بہلاوے کے لئے پگڑی اور شلوار بھی پہنی اور کہا جاتا ہے کہ اُس نے قاہرہ کے اماموں سے مشورہ کیا کہ کیا ایک غیر مختون مے نوش شخص بغیر اپنی عادات ترک کرنے کے اسلام قبول کر سکتا ہے؟ مورخین کہتے ہیں کہ طرفین اس ذہنی معرکے میں ایک دوسرے کے مقابل میں پورے اُترے۔ اماموں نے پہلے تو شراب کے نام پر بہت ناک بھوں چڑھائی پھر کہا کہ "خیر! صالح کاموں کی بہتات ہو اور اُس کا تھوڑا استعمال رہے تو چنداں حرج نہیں"۔

یہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ ایک ہولناک خبر پہنچی۔ جنرل دیزے کی فوج جو مصر بالا میں لڑ رہی تھی صحرا میں گھر لی گئی۔ یہ سُن کر مسلمانوں کے حوصلے بڑھے اور قاہرہ کی ہر مسجد کے مینار سے بجائے حی علی الصّلوٰۃ کے جہاد کے لئے اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۷۹۹ء کو مصری بے تحاشہ فرانسیسوں کے کیمپوں پر ٹوٹ پڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں آخر کار قواعد دان فوج نے باغیوں کو پچھاڑا اور پھر نہایت سختی کے ساتھ بغاوت کو رفع کیا۔ قاہرہ بھی اور نیل زیریں کے خاص خاص مقامات پر قلعے تعمیر کئے گئے اور مصر پر بہت مضبوطی کے ساتھ قبضہ کر لیا گیا۔

سال کے اخیر میں نپولین نے سفر کی سود مندی اور دلچسپی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے سویز اور جزیرہ نمائے طُور کا دورہ کیا جہاں اُس نے چشمۂ موسیٰ کی سیر بھی کی۔ لوٹتے ہوئے ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شام فرانسیسی بحیرۂ احمر کے کنارے کنارے کوچ کر رہے تھے کہ سمندر کی بڑھتی ہوئی لہر نے اُنہیں آ لیا۔ قریب تھا کہ نپولین اور اُس کے سپاہی فرعون کے لشکر کی طرح سمندر کی موجوں کے

سپرد ہو جاتے۔ مگر سپہ سالار کی چالاکی اور تیزی نے بگڑا ہوا کام بنا دیا اور سب لوگ صاف بچ کے نکل آئے۔
شہر سویز کے شمال میں رومیوں کی کھدی ہوئی نہر کے کھنڈروں کا معائنہ کرتے ہوئے مصر کو واپس آگیا

وہاں آکر اُس نے سُنا کہ سُلطانِ روم نے فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے ترکوں کی دو فوجیں ایک جزیرہ روڈز میں جمع ہو رہی ہے اور دوسری جو احمد شاہ جزار کے تحت میں شام کی طرف سے آنے والی ہے مصر کو اس کے ہاتھوں سے چھیننے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ وہ نچلا رہنے والا اور گھات میں بیٹھنے والا تو تھا ہی نہیں۔ اُسے وار روکنے کی فکر نہ ہوتی تھی ہمیشہ وار کرنیکی دُھن رہتی تھی۔ نپولین نے خیال کیا کہ اگر وہ مصر میں جم کے بیٹھا رہا تو سردیوں کی بحری ہواؤں کا وقت گزار کر ترک مشرق و شمال سے مصر پر جھپٹ پڑینگے اور نتیجہ مشتبہ اور غالباً اُسکے لئے خراب ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ ساحل شام کی فتح سے انگریزی بیڑے کے لئے قیام کرنیکو کوئی بندرگاہ باقی نہ رہیگی جوان مشرقی پانیوں میں اُس کی جائے پناہ ہیں۔ لیکن اُس کا ناظموں کو یہ لکھنا اور فوج سے یہ کہنا کہ میں ویزلے کو مصر میں چھوڑ کر باقیماندہ بارہ ہزار جنگجوؤں سے شام و ارمینیا کے عیسائیوں کو اپنے ساتھ شامل کرتا ہوا ترکوں کی قوت کو ایشیائے کوچک میں پامال کر دونگا اور پھر یا مشرق کی طرف دہلی کو یا مغرب کی طرف قسطنطنیہ کو کوچ کر دونگا غالباً محض فرانسیسی تخیل کو جوش میں لانے اور خوش کرنے کی ایک چال تھی۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ سکندرِ اعظم کے قدم بہ قدم چل کر فاتح مشرق کہلانے کی آرزو نپولین کے دل میں چٹکیاں لیتی ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ سکندر کے ذرائع آمد و رفت زیادہ محفوظ اُس کی فوج تعداد میں زیادہ رُعب داب اور اُس کا اپنا ملک ایشیا کے بہت قریب تر تھا۔ جنگِ ابوکیر کے باعث انگریزی بحری اقتدار بہت بڑھ گیا اور فرانس کے خلاف ایک نیا اتحاد بھی قائم ہو رہا تھا اگرچہ نپولین کو اس کی خبر نہ تھی
فروری ۱۷۹۹ء میں خاکنائے سویز سے گذر کر فرانیسیوں نے العریش کے قلعے پر ترکوں کی پیش خیمہ فوج کو اپنی حراست میں لے لیا لیکن قیدیوں کو اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ ایک برس تک فرانیسیوں کے خلاف ہتھیار نہ اُٹھائینگے۔ اس کے بعد حملہ آور حیفہ پر جا پڑے اور ہلہ کر کے اُسے فتح کر لیا (۷ مارچ) شہر میں لُوٹ مار اور قتلِ عام زور پر ہونے کو تھا کہ دو افسروں نے غنیم کو پناہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ نپولین اس نرمی پر بہت خفا ہوا کہ اتنے قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائیگا۔ اُن پر اتنا اعتبار نہ تھا کہ وہ فوج میں شامل کر لئے جاتے۔ یوں بھی سامانِ خوراک کی قلت تھی کچھ تامل کے بعد اپنی فوج کے اصرار

پر ان اڑھائی تین ہزار بیگناہ ترکوں کو اُس نے سمندر کے کنارے گولی سے مروا دیا۔ مغربی مورخ لکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض العریش میں حلفی وعدہ دینے کے خلاف شریکِ جنگ ہو گئے تھے اور یوں بھی جنگی مصلحت یہی تھی کہ اُن کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ کچھ بھی ہو یہ طرزِ عمل ہمارے ناموری کی شان کے سخت خلاف ہے اور ہم اُسے ملزم ٹھیرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

خود قدرت نے بہت جلد اس بُرے کام کی سزا فرانسیسیوں کو دی۔ اُن کی فوج میں طاعون نے سر نکالا اور بیسیوں سپاہی ہر روز موت کا شکار ہونے لگے۔ نپولین تیزی کے ساتھ عکہ کی طرف بڑھتا گیا جہاں تُرکی پاشا پناہ لئے ہوئے تھا۔ نپولین سمجھتا تھا کہ وہ بہت جلد عکہ کو سر کر لیگا۔ انگریزی مورخوں کا خیال ہے کہ یہ محض انگریزی مدد کی وجہ تھی کہ نپولین ناکام رہا۔ مشرقی بحیرۂ روم میں انگریزی بیڑا سر سڈنی سمتھ کی کمان میں تھا۔ ۱۵ مارچ کو اُس نے عکہ پہنچ کر کوہِ کارمل کی راس کے قریب سات فرانسیسی جہاز پکڑ لئے جو نپولین کے آلاتِ محاصرہ کو لئے ہوئے آئے تھے۔ اس بات کا اثر محاصرے پر بہت پڑا۔ انہیں فرانسیسی توپوں کو اب فصیلِ شہر پر چڑھا کر فرانسیسی فوج میں طوفانِ آتش برپا کیا گیا۔ اُدھر انگریزی بحری توپوں نے اُن پر اپنے گولے برسانے شروع کئے۔ ایک فرانسیسی شاہ پسند انجینئر محصورین کے "استحکامات" کی نگرانی کرتا تھا اور انگریزی بحری سپاہی فصیل پر حملوں کا جواب دیتے تھے۔ نو بار نپولین کے جانبازوں نے فصیلوں پر زور کے حملے کئے لیکن ہر بار ترکوں اور اُن کے حلیفوں نے اُنہیں شدت کے ساتھ پس پا کیا۔ ایک دن سر سڈنی سمتھ نے نپولین کو اپنے ساتھ کشتی کرنیکا پیغام بھیجا۔ وہاں سے خوب جواب پایا کہ اگر انگریز کوئی مارل برو[1] بھیج دیں تو میں تیار ہوں۔

اِدھر یہ شدت کی لڑائی ہو رہی تھی اُدھر ترکوں کی ایک اَور فوج عکہ والوں کی کُمک اور مصر کی فتح کے لئے دھاوے مارے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ غنیم چاروں طرف سے فرانسیسوں کو گھیرتا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک جنرل نے بمقام نظارہ اُن کو روک دیا لیکن اصلی لڑائی اسدرایلن کے میدان میں ایک پہاڑ کے قریب ہُوئی۔ وہاں کلیبر کے دو ہزار سپاہیوں کی تیس ہزار ترکوں سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ فرانسیسوں کی حالت نازک ہو رہی تھی کہ دُور سے سپہ سالار کی بڑھتی ہُوئی گولہ باری کی آواز سُنائی دی۔ جنگ کا نقشہ اَور کا اَور ہو گیا (۲۵ اپریل)، کُو ترک پسپا ہو کر ہٹ گئے۔ تاریخ حاضرہ کی کونسی لڑائی ہے جس میں ایسا حیرت انگیز اجتماع فوجی واقع ہُوا ہو۔ کلیبر کو سکندر اعظم کے کارنامے یاد آ گئے ہونگے جب وہ خاتمۂ جنگ پر بے اختیاری

---

[1] اٹھارھویں صدی میں انگلستان کا ایک مشہور جنرل گذرا ہے جس نے براعظم یورپ پر بہت سی فتوحات حاصل کیں۔

کے ساتھ نپولین سے بغلگیر ہوگیا اور کہا کہ "جنرل! تم کس قدر باکمال ہو"! اس فتح سے متاثر ہو کر لبنان کے عیسائیوں نے وعدہ کیا کہ وہ فرانسیسوں کی بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ مدد کرینگے لیکن اس شرط پر کہ پہلے عکہ سر ہو جائے ٭

عکہ سر نہ ہونا تھا نہ ہُوا۔ ہفتوں گذر گئے۔ حملے پر حملہ ہُوا کیا لیکن محصورین جُوں کی تُوں اڑے رہے اب گرمی کا موسم بھی آپہنچا۔ کڑاکے دار دُھوپ سے زمین تپنے لگی۔ ۷ رمئی کو ترکی کُمک جس کے انتظار میں اہل عکہ روز و شب سمندر کی طرف آنکھیں لگائے بیٹھے تھے آپہنچی۔ افق پر دُور دُور ترکی بادبانوں کی جھلک محصورین کے لئے امید اور نپولین کے لئے گھبراہٹ کا سامان پیدا کرنے لگی۔ چند گھنٹے تک عکہ فتح نہ ہُوا تو کبھی فتح نہ ہو سکیگا ٭ فرانسیسوں نے زور شور سے حملہ کیا اور فصیل کے کچھ حصے پر قبضہ پا کر شمال مشرقی بُرج پر سہ رنگا جھنڈا گاڑ دیا لیکن ترکوں کی مدد وقت پر آپہنچی اور دو روز کی سخت لڑائی کے بعد حملہ آور پسپا ہُوئے۔ اب طرفین لڑتے لڑتے تھک گئے تھے۔ فرانسیسوں کے کیمپ میں طاعون پھر نمودار ہو گئی۔ ۱۰ رمئی کو پھر حملہ کیا گیا جو پہلے کی طرح ناکام رہا۔ فرانسیسی سپاہیوں کے جی چھوٹ گئے۔ اور آخر کار نپولین نے طوعاً و کرہاً ۲۰ رمئی کی شب کو لوٹنے کا حکم دیدیا ٭

اس محاصرے سے جو سوا دو مہینے تک جاری رہا محض جانوں کا نقصان ہی نہیں ہُوا۔ بلکہ نپولین کو فتح ہونیکی جو شہرت حاصل تھی وہ جاتی رہی۔ اطالیہ میں کالدیرو کی شکست کو سرکاری طور پر فتح میں تبدیل کر دیا گیا تھا لیکن عکہ کی ناکامی کو کیونکر کامرانی بنا کر دکھایا جاتا؟ غرض مغرب کی قوتِ ارادی کا یہ سرکش بُت مشرق میں ترکوں کے ہاتھوں سرنگوں ہُوا ٭ اُس نے بعد میں کہا۔ کہ "مشرق کی سلطنت میری ہی ہوتی لیکن عکہ وہ کم بخت شگاف تھا جو میرے اور میری قسمت کے درمیان حائل ہو گیا" ٭ اُس کی "قسمت" بھی اہلِ مشرق کی "قسمت" سے کسی قدر مختلف تھی! قسمت کا مفہوم اکثر اپنی ہی ہٹ ہوتا تھا۔ بچپن سے اُس کی عادت یہی رہی کہ جو کچھ وہ چاہے ہو جائے ٭ لیکن غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اگر اُس کی یہ بیتاب خواہش پوری ہو جاتی تو اُس کی تباہی و بربادی یقینی تھی ٭ مہینوں کی مسافتیں طے کر کے اس چھوٹے سے لشکر کے ساتھ ہندوستان کا سر کرنا یا سلطان رُوم کی طاقت کو اُلٹ دینا محض ناممکن سا تھا اور اس میں کیا شک ہے کہ اگر نپولین اپنے تئیں اس خیالی منصوبے کے بس میں چھوڑ دیتا تو عکہ کی فتح اُس کی آخری شکست یا گرفتاری اور موت کا پیش خیمہ

ہوتی ۔ عکہ وہ جور اُستاد تھا جو مکتبِ عظمت کے اس گستاخ لڑکے کے لئے فتح کی نعمت سے کہیں بہتر تھا۔ نپولین نے ایک لامذہب عیسائی بن کر مصر و شام کے مسلمانوں کو اپنی سیاسی فریب کاریوں میں لانا چاہا لیکن وہ نہ سمجھا کہ اسلام کی قوت اپنے زوال میں بھی کتنی گہری اور پائدار ہے۔ مصر میں اسلامی ظاہرداری اور شام میں مسیحی سازش ایسی صریح دھوکے بازیاں تھیں جو چھپائے نہ چھپ سکتی تھیں!

اب فوج ناکام لوٹ رہی تھی۔ نابلو کے آس پاس کے قبیلوں نے کھلم کھلا عداوت ظاہر کی طاعون آگ کی مانند پھیلنے لگا۔ زخمیوں اور طاعون زدوں کا اُٹھائے پھرنا زیادہ مشکل ہوتا گیا۔ نپولین بھی اپنی خوش مزاجی کھو بیٹھا۔ سواروں کو پیدل چلنے کا حکم ملا تھا تاکہ بیمار اور زخمی سپاہیوں کی سواری کا انتظام ہوجائے۔ ایک سائیس نے سپہ سالار سے پوچھا کہ آپ کی سواری کے واسطے کونسا جانور رکھا ہے" نپولین نے اُسے چابک مار کر کہا "تم نے حکم نہیں سُنا کہ سب پیدل"۔ مزاج کیونکر چڑچڑا نہ ہوجاتا۔ عکہ میں وہ پانچ ہزار سپاہی کھو چکا تھا اور اب وہ روزمرہ اپنے جنگ آزماؤں کو اپنی آنکھوں سے خودکشی کرتے دیکھتا۔ خود پیدل چل کر اُس نے اوروں کے لئے اک مثال قائم کی اور جب طاعون زدوں اور زخمیوں کو افیون دیکر مار دینے کی تدبیریں ہوئیں تو اُس نے جہانتک اُس سے ہوسکا اس شیطانی کام کو رد کا جیفہ میں فوج نے سات روز قیام کیا۔ مصر پہنچے تو خلیج ابوکیر میں ترکوں نے اپنی فوج اُتاری لیکن میورا اور لان نے انہیں بہت جلد سمندر کی طرف دھکیل دیا۔

اس اثنا میں نپولین کو (بتاریخ ۶ جون) یہ اطلاع مل چکی تھی کہ فرانس کے خلاف ایک زبردست اتحاد یورپ میں قائم ہوچکا ہے۔ فرانس علاقۂ اطالیہ کھو چکا ہے اُسے دریائے رائین پر شکستیں ہو رہی ہیں اور ملک خانہ جنگی اور ناامیدی کا شکار ہو رہا ہے۔

یلغارِ مصر سے اُس کا جو ذاتی مدعا تھا یعنی اہلِ فرانس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنا وہ تو پورا ہوچکا تھا۔ اگرچہ عکہ کی خلش اس کے دل میں برابر موجود تھی لیکن پھر بھی یہ خیال تھا کہ مجھ سے جو کچھ ہوسکا میں نے کیا۔ مہم مصر کے اثر اپنی اک جدا اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ اُسے محض نپولین کے ذاتی حالات سے تعلق نہیں تھا۔ نپولین نے مصریوں کو موجودہ مہذب حکومت کا سبق دیا اور یورپ کو وادیٔ نیل کی قدیم زبان اور مصر کے پرانے کھنڈروں سے آشنا کردیا۔ روزیتہ میں تین زبانوں کا کتبہ ہاتھ آیا جس سے شاپنولی آن نے قدیم تصویری زبان کے پڑھنے کا طریقہ ایجاد کیا ضخیم تصنیف

"حالاتِ مصر" میں علماء و حکما کی اکتشافات و معلومات کا ذخیرہ جمع کیا گیا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مصر و شام کی لڑائیوں اور فتوحات نے نپولین کی شخصیت پر نامورتی اور عظمت کی دلکش کرنیں ڈالیں، جب نلسن اپنی بحری فتح کے بعد یہ کہہ کر کہ "نپولین اب جہنم رسید ہو گیا ہے" ایک شاہدِ بازاری کے ناز و ادا میں مدہوش تھا تو اُسکا دشمن زمانہ حال کے نئے سے نئے علوم و فنون کی دریافت اور اُن سے فائدہ اُٹھانے میں مصروف تھا۔ وہ متمدن یورپ سے ہزاروں میل کی مسافت پر لق و دق صحراؤں سے گذر کر دائمی شہرت کے سیمیں دروازوں کی طرف لطف تلاش کی سنہری چابیاں پہلو سے لٹکائے خوشی اور حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور اسکے صحیح مذاق کی باریک بینی صدیوں کی گتھیاں لمحوں میں سلجھا رہی تھی۔

لیکن اب اُسکے پاس وقت نہ تھا کہ وہ اک غیر ملک میں اپنی علمی دلچسپیوں میں محو رہے۔ ذاتی غرض اور ملکی خدمت دونوں کے زور نے اسے فوراً فرانس کی طرف چلدینے کی ترغیب دی یوں بھی اُس نے ناظموں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مصر میں پانچ ماہ سے زیادہ نہ ٹھیریگا اور کیا عجب ہے کہ مصر سے باہر اس سے زیادہ شاندار فتحیں اُسکا انتظار کر رہی ہوں۔ اسکے علاوہ بحیثیت قوم کے ایک سر برآوردہ سپہ سالار کے اُسکا پہلا فرض تھا کہ جہاں قوم خطرے میں ہے وہاں جائے اور سینہ کھول کر کھڑا ہو۔ اپنی فوجی خدمت کو وہاں جا کر پیش کرے جہاں صورت حوصلہ توڑنے والی اور حالات بھیانک اور خوفناک ہیں

سو فرانسیسی فوج کے زیادہ حصے کو اُس نے جنرل کلیبر کی کمان میں چھوڑا اور خود مصر سے رخصت ہوا۔ قسمت نے جس طرح آتی دفعہ اسکی رہنمائی کی تھی اب اُسی طرح پھر اُسے صحیح سلامت "بحرِ متوسط" کے پار ساحلِ فرانس پر پہنچا دیا خلافِ معمول جنوب مشرقی ہوائیں چل پڑیں بسر سڈنی سمتھ قبرس میں اپنے بیڑے کا کیل کانٹا درست کر رہا تھا نپولین نے موقع غنیمت جان کر ۲۲-۲۳ اگست کی درمیانی شب کو فرانس کا رُخ کیا اور اپنے وطن اجیشیو ٹھیرتا ہوا ۹ اکتوبر کو فریژو کے بندرگاہ میں جا پہنچا۔ اُدھر انگریزی جہاز جو مالٹا اور راس میتان کے درمیان پھرا رہے تھے بھٹکتے پھرے اُدھر نپولین نے اپنی خوش نصیبی اور نامورتی کے پہرے میں بخیر و خوبی فرانس کے ساحل پر لنگر ڈالدیئے۔ لوگوں کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ "احتساب صحت" کے قواعد سے بے پروا ہو کر وہ جہازوں پر بے تحاشہ یہ کہتے ہوئے جا چڑھے کہ "ہم آسٹریوں سے طاعون کو اچھا سمجھتے ہیں"۔ یہی خیال فرانس کے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں بجلی کی طرح دوڑ رہا تھا کہ کچھ ہو لیکن نپولین آ جائے! فرانسیسی شکستیں اُٹھا رہے ہیں تو مضائقہ نہیں کہ فاتح مشرق آتا ہے اور وہ اپنی عقل و دانش سے فرانس کو پھر فتح اور کامیابی کا زریں سہرا پہنا دیگا!!

د ب

یادِ ایّام

۱

پیکرِ حُسن بزمِ قدرت ہے — نغمہ پیرا ربابِ فطرت ہے
ایک مستی سی ہے ہواؤں میں — اک ترنم سا ہے فضاؤں میں
مستِ صہبائے حُسن ہے دُنیا — غرقِ دریائے حُسن ہے دُنیا
حُسن ہے چاند میں ستاروں میں — حُسن پھولوں میں حُسن خاروں میں
حُسن وادی میں حُسن دریا میں — حُسن گلشن میں حُسن صحرا میں
کوہ میں حُسن، جوئبار میں حُسن — نغمۂ سازِ آبشار میں حُسن

ایک دریائے حُسن جاری ہے
رُوح مصروفِ میگساری ہے

۲

چاندنی میں ہے سحرِ رعنائی — میں ہوں محوِ خیال آرائی
وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا — خوابِ شیریں تھا اک فسانہ تھا
پیار تھا چاند سے ستاروں سے — سبزہ زاروں سے کوہساروں سے
نغمۂ آبشار سے اُلفت — دامنِ جوئبار سے اُلفت
گاہ شیدائے عشقِ پروانہ — حسنِ شعلہ کا گاہ دیوانہ
جلوہ گاہِ جمال تھی دنیا — ایک رنگین خیال تھی دُنیا
رشکِ فردوس میری ہستی تھی — پیکرِ بیخودی و مستی تھی

حُسن بھی، عشقِ ناصبور بھی تھا
طُور بھی، شعلہ زارِ طور بھی تھا

۳

وقفِ طغیانیٔ شباب ہوں میں — ایک گردابِ اضطراب ہوں میں
ایک دل میں ہزار ارماں ہیں — ایک قطرے میں لاکھ طوفاں ہیں
مستِ پیمانۂ محبت ہوں — ایک دیوانۂ محبت ہوں
غرقِ دریائے حسنِ خوباں ہوں — قیدیٔ گیسوئے پریشاں ہوں
دولتِ حُسن کا بھکاری ہوں — دیرِ ہستی کا اک پجاری ہوں
سیلِ اُلفت ہے میرے سینے میں — جوششِ مے ہے آبگینے میں

برقِ بے تاب ہوں شرار ہوں میں
مثلِ سیماب، بیقرار ہوں میں

۴

عہدِ طفلی بھی خواب تھا گویا — ایک رنگیں حباب تھا گویا

مل گیا بحرِ زندگانی میں
موجِ طغیانیٔ جوانی میں

"اثر صہبائی"

ٹھیکری کا نصیب

روٹی نصیب سے ملتی ہے۔ عزت قسمت سے حاصل ہوتی ہے۔ قدر و منزلت اقبال کے بغیر میسر نہیں آتی۔ کوئی اسکو مانتا ہے۔ کوئی نہیں مانتا۔ دلیل بازی سے کچھ حاصل نہیں۔ دنیا میں تو قدم قدم پر نصیب لڑتا بھڑتا دکھائی دیتا ہے۔

بادشاہ کو جو عزت ہے اسلئے نہیں کہ اسکی دو آنکھیں ہیں دو کان ہیں۔ اور آدمی کی صورت ہے۔ یہ وجہ ہوتی تو غلام بھی بادشاہی کا دعوے کرتا۔

پھر بادشاہ بھی قسمت پلٹتے ہی گدا سے بدتر ہو جاتا ہے۔ ایک بادشاہ کیا ہزاروں بلکہ سب ایسے ہیں جو بادشاہ جیسی ہستی رکھتے ہیں مگر قسمت بادشاہ ایک ہی کو بناتی ہے۔

عالم لاکھ ہوں مگر حضرت ابو حنیفہ تقدیر کے بغیر کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیڈر بے شمار ہوں لیکن گاندھی کی شان اقبال ہی پیدا کرتا ہے۔

لاکھوں گانیوالیاں ہندوستان میں گوہر کلکتہ والی سے اچھی ہونگی مگر نصیبہ دیکھو گوہر کا کیسا چمکدار ہے پھر اگر بیچاری ٹھیکری اپنے نصیب پر روتی ہے تو ہمایوں فال ایڈیٹر ہمایوں کو اس پر ترس کیوں نہیں آتا انکو چاہیئے اس کس مپرس ٹوٹ کر پائمال ہونیوالی پر بھی کچھ توجہ فرمائیں۔

میں تو رات دن اس بے نصیب کی بپتا سننے میں مصروف رہتا ہوں اک نقطہ ہی نہیں۔ پیتل سونے کے مقابلہ میں بلور ہیرے کے مقابلہ میں رانگ چاندی کے مقابلہ میں۔ جھوٹے موتی سچے موتیوں کے مقابلہ میں اپنی اپنی قسمتوں کا رونا رویا کرتے ہیں۔ اور مجھکو انکے آنسو پونچھنے پڑا کرتے ہیں۔

پیتل نے جھوٹ کیا کہا۔ کیا وہ سونے کی طرح زرد۔ اور سونے کی طرح زمین سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ ایک ماں کے دو بچے ایک کی قسمت ایسی کہ ساری دنیا اس پر جان دیتی ہے دوسرے بھائی کو سوائے برتن والوں کے کوئی پوچھتا تک نہیں +

بلور بھی سفید۔ چمکیلا۔ جگمگاتا۔ پہاڑ کے جگر سے کٹ کر نمودار ہونیوالا۔ اور ہیرا بھی اسی کی صورت اور اسی کی طرح پیدائش پانیوالا۔ مگر ہیرے کی قیمت ہزاروں لاکھوں بلور کی ایک دو بھی نہیں۔

موتیوں کو جھوٹا کس نے کہا وہ جو سچے موتیوں کے عاشق ہیں اپنے اس محبوب کو سچا کہتے ہیں جو دنیا میں لاکھوں سے اپنے لئے جھوٹ بلواتا ہے اور پھر خود سچا کا سچا کہلاتا ہے وہ بھی کیڑے کا بیٹا یہ بھی کیڑے کے شکم میں پیدا ہونیوالا۔ کوڑی۔ گھونگا۔ دریا کے اور سینکڑوں اس جیسے جانور سب ہی موتی کی قسمت پر رشک کرتے ہیں کہ قسمت نے ایک کو سب کے گلے کا ہار کیا۔ ایک کو در بدر بھٹکایا اور رسوا سر بازار کیا۔ آخر رانگ بھی سفید ہے۔ زمین کی اگلی ہوئی دہات ہے چاندی کس بات میں اس سے زیادہ ہے جو سب چاندی پر دم دیتے ہیں اور رانگ کو چاندی سے کم بیان کرتے ہیں۔

قسمتوں کا ہیر پھیر سب سے سنتا ہوں اور آدمی کی عقل پر غصہ آتا ہے اسی نے ہیرے موتی کو۔ اسی نے سونے چاندی کو سر پر چڑھایا ہے۔ اس نے بے دلیل۔ بے وجہ ایک کو قیمتی ایک کو بے قیمت یا کم قیمت ٹھیرایا ہے۔ مگر آدمی غریب پر مجھکو ناحق غصہ آتا ہے میں آدمی نہ سہی آدمی کی شکل تو رکھتا ہوں۔ مجھے خیال کرنا چاہیئے کہ آدمی بیچارہ ہے قصور اپنے اپنے نصیب کا ہے۔

ٹھیکری کا وہ دن یاد ہے جب یہ صراحی میں تھی۔ جب تیز گرمی کے موسم میں ایک مشہور جان جہاں آدمی کی مسہری کے سرہانے تپائی پر رکھی تھی میں نے اچھی طرح دیکھا ہے کہ اسکی سہانی صورت کو بار بار پیار سے دیکھا جاتا تھا۔ اسکی سوندھی خوشبو کو سونگھا جاتا تھا۔ اس میں وہ ناک دیر تک رکھی رہتی تھی جسکی شاعر لوگ بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ آخر یہ ٹھیکری اسی صراحی کا ٹکڑا ہے جو بڑے بڑے نامور مالدار عزت والے آدمیوں میں قدر و منزلت رکھتی تھی۔ ٹوٹ گئی ٹھیکری کا کیا قصور۔ اٹھانیوالی کی نازک کلائی سے اسکا بوجھ نہ سنبھلا۔ افوہ کتنی بھاری ہے۔ کہا۔ اور بیچاری انکے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ ٹوٹ گئی۔ باہر پھینکوا دی گئی۔ یہ ٹھیکری انہی ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ہے جو اس رستہ سے گذرتا ہے ٹھوکر مارتا ہوا جاتا ہے اور یہ آپکو معلوم ہے کہ اس دروازہ سے جہاں یہ کبھی تھی ہر وقت کیسی بھیڑ گذرتی رہتی ہے شاعروں سے پوچھ لیجئے وہ تو کہتے ہیں کہ اس گھر کے دروازہ پر کل کائنات صدقے و قربان ہونے آتی ہے۔

نصیب و قسمت کی بحث کرنی نہیں ہے کہ اسکی اصلیت ہے یا نہیں ضرورت ٹھیکری کے نصیب کو جگانیکی ہے سُنا ہے جنکے ہاں صراحی تھی وہ باغ کی چمن بندی میں مصروف ہیں اور چمن بندی کی بہار کنکر۔ ٹھیکری۔ کوئلے سے خوب ہوتی ہے شاہجہاں کو معلوم ہوتا کہ کنکر پتھر اور ٹھیکریاں بھی زیبائش بڑھاتے اور بڑھانیکی قابلیت رکھتے ہیں تو وہ تاج محل کے روضہ میں جواہرات نہ لگاتا ٹھیکریاں لگا دیتا۔ اب موقع ہے ہمایوں کے ایڈیٹر صاحب کو صراحی والے گھر تک رسائی ہو تو وہ اس بے نصیب ٹھیکری کو چمن بندی کیلئے پیش کریں۔ اور ووٹ کی ضرورت ہو تو مجھ سے لو۔ مولانا تاجور سے کہیں ہم دونوں اپنے ووٹ ٹھیکری کو دینگے۔ ہیرے موتی کو نہ دینگے۔ شاید اس طرح ٹھیکری کا نصیب بیدار ہو جائے +

حسن نظامی

محفلِ ادب

آج سے پہلے پچاس سال تک قسطنطنیہ کی عورتیں مشرقی دُنیا کی عورتوں کے حقیقی درجہ پر فائز المرام تھیں، اور شکل و صورت، تربیت، اخلاق اور چال ڈھال کے لحاظ سے، شام، مصر، تونس، کوہ قاف، ایران بلکہ ہندوستان کی عورتیں بھی خواتین قسطنطنیہ کو عام نسوانی اسلام کا تاج افتخار سمجھتی تھیں اور اسوقت خواتین قسطنطنیہ ایشائی عورتوں میں وُہی درجہ رکھتی تھیں جو آج یورپین عورتوں میں فرنچ لیڈیوں کو حاصل ہے بلکہ انکی قدر و منزلت فرنچ لیڈیوں سے بھی زیادہ تھی۔

لیکن جب اُنہوں نے یورپین وضع اختیار کی اپنے درجہ سے بالکل گر پڑیں اور اگر انکی یہ وضع ایک مُدت تک قائم رہی تو انکا درجہ اس سے بھی فروتر ہو جائیگا، اور چند دنوں کے بعد مشرقی دنیا میں رومی، ارمنی اور بلغاری عورتوں کے برابر بلکہ ان سے بھی پست تر ہو جائینگی، لیکن کیا پیرس، وائنا، اور امریکہ کی لیڈیاں رومی اور ارمنی متمدن عورتوں کے برابر دوش بدوش کھڑا ہونا پسند کریگی؟

اگرچہ آج بھی ترکی خواتین کی قدر و منزلت بہت کچھ قائم ہے کیونکہ ابھی تک انہوں نے اپنی قدیم وضع کو بالکل نہیں چھوڑا ہے لیکن اگر چند روز یہی حالت قائم رہی تو اپنے قدیم درجہ کو چھوڑ کر بالکل ایک یورپین لیڈی بن جائینگی۔

پیئر لوتی[1] نے اپنے افسانۂ مصور میں استامبول کی خواتین کی نسبت رموز و کنایات میں بہت پر معنی باتیں لکھی تھیں لیکن ہم نہ صرف یہ کہ اُسکے ان رموز و کنایات سمجھ سکے بلکہ اُسکی کتاب کے عنوان یعنی نام "دختران ناشاد" کا مفہوم بھی ذہن نشین نہ کر سکے، حالانکہ لفظ "دختران ناشاد" سے اسکا مقصود یہ تھا کہ ترکی خواتین جو فرنگی طور و طریق اختیار کرکے حرم اسلام کے سحر و افسون سے محروم ہو رہی ہیں انکے نتائج بد سے ہمکو آگاہ کردے اور اسلئے فرنچ لفظ کا ترجمہ "دختران ناشاد" کے بجائے ہمکو یہ کرنا چاہیئے کہ وہ لڑکیاں جو اپنے سحر و افسون کو ہاتھ سے دے رہی ہیں" اس طرح پیر لوتی نے درحقیقت ہمکو ہمارے عالم نسوان کے متعلق بڑے خطرہ سے تنبیہ کیا تھا لیکن ہماری بدبختی کی انتہا یہ تھی کہ دختہ فرنچ اہل قلم ہمکو یورپین

---

[1] معارف:- یہ ایک فرانسیسی اہل قلم تھا جو ترکی قوم پر عاشق تھا، ترکوں کی حمایت میں اس نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، ترکوں نے اسکے اس احسان کے اعتراف میں قسطنطنیہ کی ایک سڑک کا نام "شارع پیر لوتی" رکھا تھا مگر انگریزوں نے اپنے قبضہ کے زمانہ میں اسکا نام بدلدیا (یہ واقعہ خود پیر لوتی کی زبانی پیرس میں معلوم ہُوا تھا، ابھی چند مہینے ہُوئے کہ اس نے انتقال کیا)

تمدن کے خطرات سے آگاہ کر رہا تھا اور ادھر ترک اہل قلم ترکی خواتین کی فرنگیت کے حسن و خوبی کے ترانے گا رہے تھے ترک فسانہ نویسوں میں رحمی بے اور شعراء میں ضیا بے اپنی خیالی تصویروں میں انکو عروس فرنگی بنتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے

عبدالمجید خان اور عبدالعزیز خان کے زمانہ میں ترکی عورتوں نے اپنی وضع میں کسی قدر تغیر پیدا کر لیا تھا اور قدیم عورتوں سے بہت کچھ مختلف ہو گئی تھیں اس وقت مصری عورتیں بھی انکو دنیائے اسلام کا ایک جدید نمونہ سمجھ کر پسند کرتی تھیں اور اس زمانہ میں معززین یورپ نے بھی اپنی سیاحت قسطنطنیہ کے جو حالات لکھے ہیں ان میں عورتوں کے متعلق تعظیمی خیالات ظاہر کئے ہیں اگر آج تک ترقی کی یہی صورت قائم رہتی تو آج ترکی عورتیں اپنی مطلوبہ آزادی بھی حاصل کر لیتیں اور انکو یورپین لیڈی بننے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی لیکن یورپین اور رومن مدارس اور مخصوص تربیت گاہوں نے انکو ترقی کے اس طبعی راستے سے ہٹا کر بالکل بیراہ رو کر دیا، اس وقت ممتاز خاندانوں کی عورتوں کی وضع جو بالکل یورپین قالب میں ڈھل گئی ہیں ہمارے سامنے ہے، اور اگر تمام ترکی عورتوں نے یہی وضع اختیار کر لی تو پچاس سال میں ترکی قوم کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے بالکل مٹ جائیگا، کیونکہ آئندہ نسل ترکی زبان کو فراموش کر کے دین، مذہب، قومیت، غرض تمام قومی اور مذہبی خصوصیات سے معرا ہو جائیگی بہرحال ہم اس تنقید کو صرف ایک سلبی صورت میں طول نہیں دینا چاہتے تاہم اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے درمیان ایک محدود تعداد کے سوا تمام ترکی مرد اور عورت عورتوں کی اس روش کو ناپسند کرتے ہیں اور انکی متفقہ خواہش یہ ہے کہ اس ملک کے عورتوں ترقی قومی بنیاد پر ہونی چاہئیے، لیکن اسکی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

میرا خیال ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ تمام تر ہوا و ہوس کی جلوہ آرائی ہے، اس لئے جن عورتوں نے یورپین وضع اختیار کی ہے وہ بھی اس ہوا و ہوس کا نتیجہ ہے، لیکن آج جبکہ اس فرنگی تابی کا تجربہ ہو چکا ہے اگر قسطنطنیہ کی ذکی الحس عورتوں کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ یورپین لیڈیوں کے صف پائیں میں بیٹھنے کے بجائے انکو دنیائے اسلام کی عورتوں کا پہلا درجہ حاصل کرنا چاہئیے، تو انکی وضع میں انقلاب شروع ہو جائیگا، اور بالآخر حرم میں ترکی عورتوں کو جو درجہ حاصل تھا وہ آج اس آزادی کے زمانہ میں بھی ان کو حاصل ہو جائیگا اور اس شوق کے پھیلنے کے بعد وہ اپنی وضع کو بدل کر قدیم مشرقی اور اسلامی زیب و زینت کو دوبارہ واپس کرینگی۔

میں نے اپنے دوستوں کے سامنے جب اس خیال کو ظاہر کیا تو انہوں نے کہا کہ چونکہ یہ [illegible] نمونہ پہلے سے موجود تھا اس لئے اس کا اثر بہت جلد ظاہر ہو گیا لیکن اس وقت قدیم مشرقی وضع بالکل مٹ چکی

ہے اس لئے ترکی خواتین کو بالکل معجزانہ طور پر اس وضع کو دوبارہ زندہ کرنا پڑیگا لیکن ہمکو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ناول نویس افسانہ نگار، مصور، فنون لطیفہ کے دوسرے ماہرین اس معاملہ میں عورتوں کی اعانت کریں تو وہ اس جدید مطلوبہ وضع کو پیدا کر سکتے ہیں۔ (معارف)

خیرات و اوقاف خیرات کے کاموں پر بھی کافی خرچ ہوتا تھا اس محکمہ کا صدر قاضی ہوتا تھا لیکن اکبر کیطرح شیر شاہ بھی عطیات کے مسئلہ میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ بہت سی سیاسی اور اخلاقی مصلحتوں کی بنا پر وہ متقی اور متشرع آدمیوں کو اور خیراتی مدارس کو اس فراخدستی سے وظیفے دیتا کہ آخر زمانہ کے تاریخ نویسوں نے بہت سخت الفاظ میں اسکے خلاف لکھا ہے لیکن وہ نہ تو لاپرواہ تھا اور نہ از حد فیاض۔ اس نے ان تمام عطیات کو منسوخ کر دیا جو اسکے قبل غیر افغانی ہاتھو سے دیئے گئے تھے لیکن اس نے لوگوں کو مفلس نہ بنا دیا۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ وہ عالم اور پابند مذہب طبقہ کو اپنی یعنی افغانوں کی طرف کر لینا چاہتا تھا اور وہ ان عطیات کو پھر معقول اور مناسب طور پر تقسیم کرنا چاہتا تھا۔ اسکا اصول تھا کہ کوئی مستحق شخص محروم نہ رہ جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ نہ پا جائے۔

شیر شاہ نے اس معاملہ میں بہت زیادہ نرمی اور سہولت سے کام لیا اس وجہ سے وہ ان تمام الزامات سے بچ گیا جو علاء الدین خلجی اور خصوصاً اکبر پر عائد کئے جاتے ہیں ایک پرگنہ کے سارے جاگیردار ایک ساتھ دربار میں بلائے جاتے تھے انکے ساتھ بہت نرمی کا برتاؤ کیا جاتا اور واپس کرتے وقت انہیں زاد راہ بھی دیدیا جاتا تھا سب سے زیادہ اسکا خیال رکھا جاتا تھا کہ کاتب لوگوں کو پریشان نہ کریں اور دھوکہ نہ دے سکیں لہذا شیر شاہ ہر کاغذ کو خود دیکھ لیتا اور اُسے متعلقہ پرگنہ میں اپنے معتمد ملازموں کے ذریعہ سے بھیجتا تھا۔

مسجدوں اور مدرسوں کے انتظام کرنیکے علاوہ وہ حقدار طلباء اور معلموں کو وظائف بھی دیتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک طالب کو ۵۰۰ روپیہ اور ۵۰۰ بیگہ زمین عطا کی۔ بیمار، ضعیف، غربا، بیوگان، اور اندھوں کے واسطے کافی انتظام تھا غریب خانے جہاں قیام اور طعام مفت تھا اکثر مقامات پر کھولے جاتے تھے۔ سفر میں اسکے ہمراہ ایک لنگر خانہ ہوتا تھا جس میں محتاجوں کو ہر وقت کھانا ملتا خواہ وہ سپاہی ہوں یا کاشتکار یا فقیر۔ اسکے لنگر خانہ کا خرچ اس زمانہ میں ایک لاکھ اٹھارہ ہزار اشرفی تھا جبکہ چیزیں آجکل سے کئی گنی ارزاں ہاتی تھیں۔

موجودہ ذرائع سفر کے ایجاد ہونے سے قبل سفر کرنا ایک زحمت تھی اور اس وجہ سے مسافر کے

موجودہ ذرائع سفر کے ایجاد ہونے سے قبل سفر کرنا ایک زحمت تھی! اور اسی وجہ سے مسافر کے ساتھ ہر جگہ ہمدردی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مسلمان اور ہندو دونوں مسافر نوازی کو ایک اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ شیر شاہ بھی اور بڑے بڑے بادشاہوں کی طرح مسافروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سڑکوں کو اچھی حالت میں اور خطروں سے محفوظ رکھنے کی بہت زیادہ کوشش کی کچھ نئی سڑکیں بنوائیں۔ اور پرانی سڑکوں کی مرمت کرائی۔ شاہراہوں میں سے ایک گور (بنگال) سے اودھ تک دوسری بنارس سے مانڈو اور سرحد دکن تک تیسری آگرہ سے بیانا تک ہوتی ہوئی سرحد جودھ پور تک اور چوتھی بیانا سے جونپور تک جاتی تھی۔ اس نے آگرہ اور دہلی کے درمیان جنگل کاٹ کر ایک سڑک نکالی جس سے مسافت بہت کم ہوگئی ورنہ مسافروں کو دوآبے سے گزر کر جانا پڑتا تھا اور اس میں چکر بہت تھا۔

سڑکیں آجکل کی سڑکوں کی طرح لمبی اور سنسان نہیں ہوتی تھیں۔ ہر بڑی سڑک پر اور خصوصاً شاہراہ عظمیٰ پر جو سونار گاؤں سے انڈس تک جاتی تھی اور اس سڑک پر جو آگرہ سے برہان پور کے قریب تک جاتی ہے ہر ہر کوس پر ایک سرائے۔ ایک پختہ کنواں ایک باغ اور ایک مسجد ہوتی تھی۔ اور اوقاف کی مدد سے جو اسی غرض کے لئے مخصوص تھے برابر ان کی مرمت ہوتی رہتی تھی۔ ان سراؤں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قیام کا علیحدہ علیحدہ انتظام تھا ہندو اور مسلمان ملازم مسافروں کے واسطے سرد اور گرم پانی پختہ یا خام جنس اور دیگر ضروریات کے مہیا کرنیکے لئے رکھے جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان سڑکوں پر مسافر نہایت اطمینان سے اپنا اسباب کسی درخت کے نیچے رکھ کر اپنے گھوڑے یا مویشی چرانے جاسکتا ہے اور ایک بڈھی عورت بھی بلاخوف و خطر زر و جواہر ساتھ لیکر تنہا سفر کرسکتی ہے مسافروں کو سب سے زیادہ آرام ان ثمردار درختوں سے پہنچتا تھا جو دورویہ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ صرف تمازت آفتاب سے بچانے کے لئے ہی نہ تھے بلکہ مسافر اکثر انکے پھلوں سے بھی فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ آم۔ جامن۔ بیر اور کھرنی کے درخت سڑک کے دونوں جانب لگائے جاتے تھے اور مسافر بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے مفت انہیں توڑ توڑ کر اپنی اشتہا دور کرتے تھے۔ یہ تحقیق نہ ہوسکا کہ یہ سڑکیں پختہ تھیں یا خام غالباً خام ہی ہونگی ؛

(جامعہ)

نمبر ۵

فہرست مضامین بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۴ء

جہاں نُما

خلافت ختم ہوگئی اسلامی دُنیا میں اک شور مچ گیا کہ خلافت کا مُقدس عہدہ منسوخ کر دیا گیا۔ وہ ترک جنکی آزادی کیلئے انکے غلام بھائی اتنا شور وغل مچاتے رہے جنہوں نے اسلام کے جھنڈے کو وائنا کے قریب جاکر گاڑ دیا تھا جنکی بحری طاقت کے سامنے یورپ کی متفقہ دولتیں کانپتی تھیں اور اب جنکے ساتھ مُسلمانوں کی رہی سہی اُمیدیں وابستہ تھیں جو یورپ میں اسلام کے نام لیوا اور ایشیا میں اُس کے پاسبان تھے جو موجودہ تمدن کے میدان میں دینِ مصطفٰے کے تنہا علمبردار تھے انہوں نے مغرب کے جابروں سے بچ کر اپنی قومی زندگی کی بازی جیت کر بغیر کسی کے دباؤ کے بلا ترغیب و تحریص اپنے ہاتھوں اسلامی خلافت کے درخت کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔ کان اس خبر کو سُن کر آنکھیں اسے پڑھ کر یقین نہ کرتی تھیں کہ فی الحقیقت یہ ایسا ہی ہے کیسے ہوسکتا ہے کہ باغبان اپنے بار آور پودے کی بیخکنی کرے بچہ اپنی ماں کو گھر سے باہر نکالدے مچھلی اپنی مرضی سے پانی سے باہر رہنا گوارا کرے؟ لیکن مانیں نہ مانیں جو نہ ہونا تھا سو ہوگیا جو نہ ہونا چاہیئے تھا وہی ہُوا۔ اس عجائبات کے زمانے میں انسان کسی بات پر بھی کیوں متعجب ہو اس اختراعات کے وقت میں ہم کیسے اس وہم وگمان میں رہیں کہ دنیا میں بعض چیزیں اٹل ہیں؟ سب کچھ تبدیل کیا جاسکتا ہے اور پُرانی چیزوں کو تو اب پُرانے ہی لوگ پُوچھتے ہیں نئی روشنی اُن پر اپنی اک کرن ڈالنا بھی خلافِ شان سمجھتی ہے!

ترک کہتے ہیں ہر ایک کو پہلے اپنی پھر دوسرے کی بہتری کا خیال ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو جب آپ ہی نہ جئے جب اپنی ہی آبرو میں بٹہ لگنے کو ہو تو غیر یا کسی دوسرے کی بہبودی کے منصوبے باندھنا جہالت کا ثبوت ہے۔ مدتوں ہم خلافت کا بوجھ اپنے سر لئے رہے خلیفۃ المسلمین نے ہمارا بادشاہ بن کر ہم پر وہ سب ظلم کئے جن کی برداشت کا خیال بھی اب تکلیف دہ ہے ہمیں غلاموں کی طرح استعمال کیا ہمارے ذریعے سے اوروں کے ساتھ لڑ بھڑ کر قوم کو جان جوکھوں میں ڈالا اور ایسی ایسی بلاؤں میں اُسے جا پھنسایا جن سے جان لیکر بچنا بھی دشوار نظر آیا۔ اب جبکہ اپنی ہمت اور خدا کی برکت سے ہم نے دشمنوں کے پنجے سے رہائی پالی ہے کیونکر اپنے دوستوں کے قابو میں رہ کر ہم زندگی سے لُطف اُٹھائیں۔ ہم نے آزادی حاصل کرلی ہے اور ہم آزادی چاہتے ہیں۔ ہر شئے سے خواہ وہ دُنیا کی زنجیر ہو یا دین کی بندش کسی ایک شخص کے ماتحت رہ کر اُس کے احکام کو عمر بھر

پتھر کی لکیر سمجھے رہنا اپنی زندگیوں کو اُسکے اک اشارے پر قربان کرنیکے لئے تیار رہنا فقط اسلئے کہ وہ بادشاہ یا خلیفہ مان لیا گیا ایسی باتیں ہیں جنکا دورِ حاضر میں گوارا رکھنا آپ اپنی حیاتِ اجتماعی کے گلے پر کُند چھری پھیرنا ہے۔ اس معاملے میں دُنیا بھر کے مُسلمانوں کا ہماری گردن پر سوار ہونا انصاف سے بعید ہے وہ چاہتے ہیں خلیفہ کا بوجھ ہم اُٹھائیں اور خلافت کی عزت سے وہ مستفید ہوں ہمیں اپنی قوم سے غرض ہے ہمیں خلافت سے سروکار نہیں ہم عمل کے دلدادہ ہیں خیالات کے پرستار نہیں۔ ہمیں موجودہ تمدنی ضروریات کو پورا کرنا ہے اسکے ساتھ پُرانی لاحاصل باتوں کا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے پھرنا ناممکن ہے جنکے ساتھ رہنا جنکے ساتھ لڑنا جنکے ساتھ تعلقات رکھنا ہے اُنہیں کے طریقے نہ برتیں تو دُنیا میں گذارہ محال ہوگا *

صاحبو! یہ سب کچھ درست ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ وقتی کامیابیاں علمی مطابقتیں اور عملی کارروائیاں ہی دُنیا کی زندگی کا میزان ہیں۔ کیا وقتی ضرورت کے خیال سے آپ تمام اُن خیالات کو بالائے طاق رکھدینگے جو آپکے بزرگوں اور رہنماؤں نے ودیعت کئے ہیں کیا آپکے ہم مذہبوں کے احساسات کا آپکو کچھ احساس نہیں ہے؟ اور اگر ایسا ہی ہے تو پہلے ہی آپ ہمیں آگاہ کر دیتے کہ خلافت تو ایک لفافہ ہے اصلیت اور ہے ہمارے قدامت پسند اپنا گھر بار آپ کی نذر کر چکے اور اب آپ کہتے ہیں کہ وہ خیال ہی فضول تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خلافت اپنی اصلیت کو کھو چکی تھی لیکن اس کا انہدام ضروری ہو بھی تو تخریب کے ساتھ ہی تعمیر کا اعلان بھی ضروری تھا۔ بہت خوب توہمات کو برطرف کیجئے شوق سے کیجئے لیکن اصل مذہب کو نظرانداز نہ کیجئے کہ اسی سے نہ صرف اسلامی حیاتِ مجموعی قائم ہے بلکہ آپکی قومی زندگی کا دارومدار بھی آخر کار اسی پر ہوگا کہ مغرب بھی اتنا غیر متعصب نہیں جتنا کہ اُسکے علماء کا دعوےٰ ہے *

بھائیو! اگر خلافت انہیں منظور نہیں تو نہ سہی خلافت کو اتنے سستے داموں نہ بیچو کہ یہ اگر بکنے کے قابل ہو چکی ہے تو بہتر ہے کہ اسے فنا کر دیا جائے۔ لیکن یہ فنا کیوں ہو، اس زمانے میں جبکہ اسلامی جماعتوں کو آزادی مل رہی ہے زیادہ ضرورت ہے کہ اُن کو یکجا کرنے کا ذریعہ پیدا کیا جائے ایسا ذریعہ جس سے نہ صرف مسلمانوں کو ترقی ہو بلکہ دُنیا بھر کو فوائد حاصل ہوں *

د۔ ب

نپولین بسترِ مرگ پر

وہی تیرا انجام ہُوا جو سب کا ہوتا ہے! چند برس تُو دشتِ زندگی میں بھاگا دوڑا تیرے قدموں کی گرد سے ہولناک آندھیاں اُٹھیں دل سینوں میں دہلے، آنکھیں تیرے آفتابِ اقبال کی کرنوں سے چندھیا گئیں۔ تُو نے دُنیا کو واقعی اک میدانِ جنگ تصور کیا، زندگی تیرے لئے جد وجہد تھی۔ تُو آپ بیچین رہا اوروں کو بیچین کیا۔ اکثر دن رات جاگا اکثر دن رات گھوڑے پر سوار رہا۔ تُو عظمت اور شہرت کے پیچھے سرگرداں رہا تیری ہوس انکو پا کر کھوتی رہی اور پھر اسی مسلسل جستجو میں رہی لیکن آخر کار جو تُو چاہتا تھا وہ نہ پا سکا۔ تیری شان میں عظمت اور تیرے نام کو شہرت ضرور نصیب ہُوئی مگر تیرے دامن پر دھبے بھی ضرور لگے اور تیری زندگی کا کام ادھورا رہا +

نپولین ایک معمولی وکیل کا لڑکا لیکن ایک روشن دماغ ماں کا بچہ تھا۔ وہ کارسیکا کے جزیرے میں اُن دنوں پیدا ہُوا جب فرانسیسی اس کے وطن کی آزادی چھین رہے تھے۔ اُسے وطن چھوڑ کر اپنے وطن کے دشمنوں کے پاس پناہ لینی پڑی۔ وہاں فوج میں داخل ہُوا اور انقلابی حکومت کی حمایت میں بندرگاہِ طولون میں اُس نے وہ خدمت انجام دی جس سے وہ مشہور ہو گیا۔ بہت سے انقلابات کے بعد وہ اطالیہ میں فرانسیسی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ یہاں اُس نے ایسی فتوحات حاصل کیں کہ اربابِ حکومت نے حسد اور خوف کے مارے اُسے مصر بھیجدیا + مصر میں پہنچ کر اُس نے مشرق کو مغلوب کرنیکی ٹھان لی اور اپنی شہرت میں چار چاند لگائے + واپسی پر وہ جلد ہی فرانس کا اصلی حاکم پھر قنصلِ اعظم پھر شاہنشاہ بن گیا ہاُسکی ہوس کی دُنیا دن بدن بڑھتی گئی۔ دولِ یورپ نے یکے بعد دیگرے اُسکے خلاف اتحادوں کا سلسلہ قائم کیا اور دُنیائے مغرب کی رزمگاہ میں لڑائیوں پر لڑائیاں ہونے لگیں + پہلے اطالیہ پھر جرمنی اور بلجیم اور ہالینڈ پھر سپین اور آسٹریا اور رُوس پس پا ہُوئے تھے اب رُوس نے اپنے دار الخلافے کو جلا کر خاکستر کر دیا اور مُلک بھر کو اک بیاباں بنا دیا پھر جرمنی اور سپین اور آسٹریا اور انگلستان متفق و متحد ہو کر اُٹھے اور لوگوں نے آزادی کے لئے اپنے گھر بار اور اپنی جان و مال کو قربان کر دینا ضروری سمجھا + قومیں بیدار ہُوئیں آزادی نے نعرہ بلند کیا اور انسانیت چاروں طرف سے ہوس پر بڑھی اور اُسے گھیر کر قید کر لیا +

یہی وہ شخص ہے جس نے فرانسیسی قوم کو متحد کیا اُسمیں شہنشاہیت کی رُوح پھونکی مُردہ قوموں میں ربط و ضبط قائم کیا اُنمیں علم و ہنر کا چرچا کیا یہی وہ شخص ہے جس نے انتہائی کوشش و ہمت کی جد وجہد اور ہمت و استقلال کے بعض بے نظیر نمونے دُنیا کے سامنے پیش کئے۔ پھر یہی وہ شخص ہے جس نے اک دُنیا کو جبر و بندش کی بیڑیاں پہنائیں جسکی سختیوں نے اک دُنیا کو بیدار کر دیا اور جو اپنی ہوس کے ہاتھوں آپ تباہ ہُوا + ذاتی شہرت کا شیدائی شکر ہے اب تو آرام سے پڑا ہے!

دبل

فلسفۂ خودی

تو بہ معنی جانِ جملہ عالمے
ہر دو عالم خود توئی بنگر دمے (عطار رح)

"کائنات، ہمارے تصوّرات کا ایک مجموعہ ہے"

نظریۂ بالا کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل مقدمات کو ذہن نشین کر لیجئے۔

۱۔ کائنات، یا تو محسوس ہے یا معقول۔

۲۔ معقول بھی محسوس سے ماخوذ ہوتا ہے۔ کسی امرِ معقول کی تحلیل کیجئے تو آخر میں محسوسات ہی ہاتھ آئینگے

۳۔ کسی محسوس کا وجودِ خارجی نہیں، ہر محسوس ہمارا ایک تصوّرِ نفسی ہے اور بس۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ کائنات جو سراسر ایک محسوس شئے ہے، صرف ہمارا تصوّرِ نفسی ہے۔

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ

"اگر کوئی شخص اپنے معلومات کی جانچ کرے تو اُسکو صاف نظر آئیگا کہ وہ یا تو ایسے تصوّرات ہیں جو فی الواقع آلاتِ حس پر مرتسم ہوتے ہیں، یا اپنے نفس کے جذبات و انفعال پر توجہ کرنے سے اُنکا ادراک ہوتا ہے یا پھر حافظہ اور تخیل کی مدد سے انہیں دو صنفوں کی باہمی ترکیب و تحلیل یا بعینہٖ اعادہ سے بنتے ہیں' آنکھ سے ہمکو روشنی، رنگ اور اُنکے مختلف انواع و مدارج کے تصوّرات حاصل ہوتے ہیں' چھونے سے سختی، نرمی، سردی، گرمی، حرکت، مدافعت اور اُنکی کمیّت و کیفیت کا پتہ چلتا ہے، سونگھنے سے بو کا، چکھنے سے، ذائقے کا، سُننے سے لہجوں اور ترکیبوں کے اختلاف سمیت ہمارے ذہن تک آوازیں پہنچتی ہیں اور چونکہ ان تصوّرات میں سے کئی کئی کا ایک دوسرے کے ساتھ علم ہوتا ہے، اس لئے اُنکا ایک ہی نام پڑ جاتا ہے مثلاً ایک رنگ، مزہ، بو، شکل و صورت کا جب ہمیشہ یکجا علم ہوتا ہے تو اُس کا نام سیب رکھ لیا جاتا ہے' اسی طرح تصوّرات کے اور مجموعوں میں سے کسی کا نام پتھر ہو جاتا ہے، کسی کا درخت کسی کا کتاب، کسی کا کچھ، کسی کا کچھ' لیکن تصوّرات کے ان بیشمار اصناف سے علاوہ ایک اور شئے ہے جو انکا علم یا ادراک کرتی ہے اور ان پر ارادہ، تخیل، حفظ وغیرہ کے مختلف تصرّفات کرتی ہے یہی مدرک و متصرف ہستی ہے جسکو ہم ذہن، نفس، روح، یا اَنا کہتے ہیں"

[ماخوذ از مبادی علم انسانی ترجمہ پرنسپلس آف ہیومن نالج Principles of Human Knowledge بند ۱]

یہانتک جو کچھ کہا گیا، فلسفۂ تصوریت کے نقطۂ نظر سے تھا، جسکے اعتبار سے، ہمارا نفس، اصل کائنات ہے، یعنی کائنات محسوس کیا ہے؟ ہمارے نفس کے آفریدہ تصورات کا مجموعہ" لیکن یہ عقدہ ابھی وا نہیں ہُوا ہے کہ ہماری انانیت یا خودی کیا ہے؟۔ یہ تو کہا جا چکا ہے کہ نفس ایک ذی شعور ہستی کا نام ہے، جسکے مخصوص افعال، احساس، تحفظ، تخیل، توہم، تفکر اور ارادہ ہیں، لیکن یہ ابھی کہنے کو باقی ہے کہ نفس کا خود اپنا یعنی اپنی ذات کا شعور، یہی انانیت یا خودی ہے، نفس اور خودی کے درمیان کوئی علامتِ فارق نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے نفس اور اپنی خودی کا جدا جدا تصور نہیں کر سکتے، اگر ہم خود اپنا تصور کریں تو بعینہ یہی خودی کا تصور ہو گا، جو افعال ہماری ذات سے منسوب کئے جاتے، وہی خودی کی طرف بھی منسوب ہو سکتے ہیں، اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالمِ محسوس کیا ہے؟ ہماری خودی کا ایک احساس" اور یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا۔ غور کیجئے۔

اب ہم ایک دوسرے نظرئیے، وحدت وجود کے ماتحت، اپنے موضوع کلام پر غور کرتے ہیں۔

کائنات میں دو قسم کی چیزیں پائی جاتی "قائم بالذات اور قائم بالغیر، پہلی قسم کو جوہر اور دوسری کو عرض کہتے ہیں، عرض جب پایا جائیگا، کسی جوہر کے ساتھ اور جوہر ہمیشہ کسی عرض کی شکل میں پایا جائیگا، دونوں میں ناقابلِ انفکاک تعلق ہے۔ یہ وہ تعریف ہے جو عرض و جوہر کی عموماً کی جاتی ہے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ اعراض کا کوئی جداگانہ وجود نہیں ہوتا، جوہر ہی، اُن مظاہر کی صورت میں، جو عوارض کہلاتے ہیں، رونما ہوتا ہے۔

اسی قبیل کی ایک دوسری غلطی عرض و جوہر کے تعین میں یہ کی جاتی ہے کہ متعدد چیزوں کو جوہر سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یا تو ایک ہیولیٰ، بقول مادین، جوہر کائنات ہے یا بقولِ روحانیں، ایک نفس کلی، متعدد جواہر کا اثبات، خلافِ تحقیق ہے

خیر یہ تو بطور تمہید تھا، اب ہم آپکو آپکی طرف توجہ دلاتے ہیں، آپکی ہستی آپ کے لئے سب سے بڑی معلم ہے، ذرا اپنی طرف تو غور فرمائیے، آپ ہیں کیا، یعنی آپکی حقیقت کیا ہے؟

ہم اپنے تمام ماحول کو اپنا کہتے ہیں، یہ ہمارا، وہ ہمارا، الیٰ غیر نہایتہ، اس سے ایک تعلق کا پتہ چلتا ہے، جو ہمکو اپنے ماحول سے ہے، اور ایک بے تعلقی کا بھی، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "ہمارا خیال" تو اسکے یہی معنی ہوتے کہ اگرچہ ہمیں اپنے خیال سے ایک وابستگی ہے، لیکن خیال اور ہے ہم اور۔ اس معمہ کو حل کرنے کے لئے تین امر قابل تنقیح ہیں،

۱۔ ہم کیا ہیں؟

۲۔ ہمارا ماحول کیا ہے؟

۳۔ ہمارے ماحول اور ہم میں کیا تعلق ہے؟

فلسفہ وحدت وجود، ان ہرسہ تنقیحات کا حسب ذیل جواب دیتا ہے، ہماری حقیقت، ایک تجلّی نفسِ کلی ہے، ہمارا ماحول، ہماری حقیقت کا مظہر ہے، ہم میں اور ہمارے ماحول میں وہی تعلق ہے جو ایک شئے اور اسکے ہر مظہر میں ہوتا ہے، (یعنی بے ہمہ و باہمہ اُسکا ہر مظہر اُسکا ہوتا ہے اور کوئی مظہر اُسکی طرح نہیں ہوتا) ہمارے ماحول کا کوئی جداگانہ وجود نہیں، ہمیں اپنے ماحول کی صورت میں ظاہر ہیں، کل کائنات ہمارا ماحول ور مجموعہ اعراض، اور ہم جوہر کائنات ہیں، لیکن ہماری یہ تعمیم شخصی، نوعی اور جنسی امتیازات کو حذف کرنیکے بعد ہے، اسلئے کہ یہ سب از قبیلِ اعراض ہیں اور ایک جوہر کا تصورِ کلی بغیر انکے حذف و اسقاط کے ناممکن ہے"

یہ ہے خودی کی اصلیت نظریۂ وحدت کے اعتبار سے، ہر دو نظریئے یعنی نظریہ وحدت و تصوریت اس امر پر متحد ہیں کہ کائنات، نام ہے، ہمارے نفس کے مظاہر کا، لیکن ان مظاہر کی حقیقت کیا ہے؟ اعراض ہیں یا احساساتِ نفس، اس امر میں بظاہر دونوں مختلف نظر آتے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ اختلاف صرف لفظی ہے۔ فلسفۂ وحدت کہتا ہے کہ عالم مجموعۂ اعراض ہے اور نفس جوہر، نظریہ تصوریت کہتا ہے کہ عالم، مجموعہ ہے تصورات کا اور نفس، مدرک ہے، اب غور کیجئے تو جو تعلق عرض کا جوہر کے ساتھ ہے، وہی تصور کا نفس مدرکہ کے ساتھ، نہ تصور کا کوئی جداگانہ وجود ہے، نہ عرض کا، جس طرح تصور مظہر نفس کا، اسی طرح عرض مظہر ہے جوہر کا، نہ وہاں ماحولِ نفس، غیرِ نفس ہے، نہ یہاں ماحول جوہر، غیر جوہر ہے، مطابقت کے اور پہلو بھی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہنا یہ مقصود تھا کہ دونوں نظریئے اس امر پر متحد ہیں کہ ہر شئے میں انسان کی جلوہ گری ہے، نہیں، نہیں، ہر شئے انسان ہی کا مظہر ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ عالم اور کائنات وغیرہ ناموں سے انسان ہی مراد ہے، یہ ہے انتہائے خودی!

اب ہم اخلاقی نقطۂ نظر سے خودی کو دیکھتے ہیں۔

اگر ہمارے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد عدل و مساوات پر ہے تو ہمیں کبر و انا، غرور و خودی، مذموم اخلاق کی فہرست میں نظر آئینگے اور آنا چاہیئے جسکی وجہ ہے اور وہ یہ کہ جب ایک انسان کی نظرِ کوتاہ میں اپنی شخصی محدود خودی کے آگے کچھ نہیں دکھتی تو وہ ہر حقیقت کے ساتھ اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیتی ہے کہ مثل میرے اس جہان میں اور افراد انسانی کو بھی مساوی حقوق حاصل ہیں، اور یہی جہل جو بدتر از کفر ہے گویا کہ ہر ظلم و ستم کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، دنیائے اخلاق میں جو کچھ قیامت برپا ہے وہ صرف اس غلط فہمی کی بنا ہے! اسلئے اس خودی کو جو سراسر بدی ہے کیوں نہ مذموم سمجھا جائے، یہ تو نتیجہ ہوتا ہے ہماری کوتاہ نظری کا، لیکن ہماری وسیع النظری، ایک نئی بلا دنیائے اخلاق کیلئے ثابت ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ جب بعض نام نہاد دوربیں اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جب ہمیں ہم، کل کائنات میں جلوہ طراز ہیں، تو کیسا حفظِ مراتب کیسا پاسِ ادب! حقوق کی نگہداشت کیا شئے ہے ؎ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ ۔ خود رند سبو کش۔ تو وہ کوئی کوتاہی اخلاق انسانی کے پامال کرنے میں نہیں کرتے یہ ایک بڑی مصیبت ہے کہ ایسے لوگ جہل مرکب میں گرفتار ہوتے ہیں وہ اپنے آپکو وسیع النظر سمجھتے ہیں پر ہوتے ہیں اندھے حقیقت تو یہ ہے کہ کمالِ انسانی کا راز علم حقیقی میں پنہاں ہے علم جہاں انسان کو اُسکی ہمہ گیری دکھاتا ہے وہاں قوانین فطرت کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہے۔

(باقی آیندہ)
گویا

تلاشِ سکون

لالہ و گل کا جوش ہے
غنچہ سبو بدوش ہے
نغمۂ و ناؤ نوش ہے
سازِ جنوں فروش ہے
رخصتِ عقل و ہوش ہے   دل کو مگر سکون کہاں؟

بلبلِ ہرچمن خموش
قلزمِ موجزن خموش
فطرتِ کوہکن خموش
میکدۂ زمن خموش
تاروں کی انجمن خموش   دل کو مگر سکون کہاں؟

داغِ جگر دکھا لیا
قصۂ غم سُنا لیا
ساحلِ بحر پا لیا
اپنا اسے بنا لیا
لطفِ حیات اُٹھا لیا   دل کو مگر سکوں کہاں؟

ساقئ پاکباز ہے
مطربِ دلنواز ہے
جلوہ گۂ حجاز ہے
انجمنِ نیاز ہے
آپ وہ چارہ ساز ہے   دل کو مگر سکون کہاں؟

مستِ شرابِ ناب ہوں
نقطۂ انتخاب ہوں
عاشقِ کامیاب ہوں
بے خبر عتاب ہوں
قبر میں محوِ خواب ہوں   دل کو مگر سکون کہاں

اصغر حسین خاں نظیرؔ
لودیانوی

ذاتی اِعتماد

"میں خدا سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے ضرور پورا کر کے رہونگا"۔

ستمبر ۱۸۶۲ء میں جب لنکن نے ابتدائی آزادی کا اعلان کیا، جو اُنیسویں صدی کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ سمجھا جاتا ہے، تو اُس نے اپنے روز نامچے میں ذیل کا فقرہ لکھا،

"میں خدا سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے ضرور پورا کر کے رہونگا"۔

کیا کوئی خیال کرسکتا ہے کہ یہ قوی ارادہ اس عجیب و غریب انسان کے لئے کس قدر تقویت کا باعث ہُوا، یا اس نے اُسکے وعدے کی تکمیل میں کس قدر مدددی لوگوں کے آوازے اور مضحکے دشمنوں کا خوف اور دوستوں کی جدائی یہ تمام باتیں اُسکے پائے ثبات اور مضبوط ارادوں میں جنبش نہ دے سکیں +

نپولین، بسمارک اور تمام مشہور فاتح اسی قسم کا اٹل اور راسخ اعتقاد رکھتے تھے جو اُنکے معمولی ارادوں اور بجھے ہوئے ولولوں میں سہ چند اور بسا اوقات اس سے بھی زیادہ جوش پیدا کر دیا کرتا تھا، اور صرف یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے ہم لیو تھر، دسلے، سا دونورلا کی فتحمندیوں کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں یہ بلند خیالی اور اپنے مقاصد کی صداقت پر اعتماد ہی تھا کہ ایک دیہاتی اور سادہ زندگی بسر کرنے والی لڑکی جون آف ارک تمام فرانسیسی فوج کو اپنے قبضے میں کر کے اُنکی قائد اعظم بن گئی یہی نہیں بلکہ ایک دن خود بادشاہ کو بھی اُس کے سامنے سر اطاعت جُھکا دینا پڑا۔

یہ اُسکا خدا داد استقلال اور ذاتی اعتماد ہی تھا جس نے اُسکی طاقتوں کو ہزاروں درجے تک بڑھا دیا اور اُس نے بچوں کی طرح ایک جنگ آزما فوج کی قیادت کی۔

جب ولیم پٹ اپنے معزز عہدے سے برخاست کر دیا گیا تو اُس نے ڈیوک آف ڈیواں شائر سے کہا "مجھے یقین ہے کہ میرے سوا کوئی اس ملک کی حفاظت نہیں کرسکتا"۔

چنانچہ بنکرافٹ کہتا ہے کہ گیارہ ہفتے تک انگلستان کی وزارت خالی رہی اور بالآخر بادشاہ اور اراکین سلطنت نے پٹ کی اعلےٰ قابلیت کا اعتراف کرتے ہُوئے عنانِ حکومت اُسکے سپرد کر دی۔

اسی طرح بنجمن ڈیسا رُ لی جو ایک یہودی ہونے کی حیثیت سے نفرت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا،

اُسے اپنی قابلیت پر اس درجہ بھروسہ تھا کہ ایک دن اُس نے انگلستان کے بچے بچے سے اپنی فضیلت و قابلیت کا اعتراف کرا کے چھوڑا۔

وہ برٹش پارلیمنٹ میں اپنے متعلق مضحکہ اور توہین آمیز کلمات سُن کر کبھی مضمحل یا شکستہ خاطر نہ ہوتا تھا بلکہ اکثر یہ کہتا ہُوا بیٹھ جاتا کہ "ضرور تمہیں میری باتیں سُننا ہونگی" چنانچہ اسی خودداری و خود اعتمادی کی بدولت وہ ایک دن انگلستان کا وزیر اعظم بن گیا اور اُسکی وہ تمام برائیاں اور مضحکہ انگیز باتیں ثنا و صفت سے بدل گئیں۔

پریسیڈنٹ روزی ولٹ کی کامیابیوں کا انحصار زیادہ تر اسکے غیر معمولی ذاتی اعتماد پر تھا، وہ اپنے متعلق ویسا ہی خیال کرتا تھا جیسا کہ نپولین اپنے متعلق، مایوسی و بددلی اُسکے نزدیک بے معنی الفاظ تھے، وہ ہر جگہ اپنی کامیابی کے کامل وثوق کے ساتھ جاتا تھا، اُسے کسی کام کو اختتام تک پہنچانے کا اس قدر پختہ یقین ہوتا تھا کہ مشکل سے مشکل کام اُسکے لئے شروع کرنے سے پہلے نصف رہ جاتا۔

بادی النظر میں یہ ضرور تعجب خیز بات ہوگی کہ ایک مستقل مزاج شخص کے لئے کس طرح دُنیا خود بخود وسیع ہوجاتی ہے، اور ایک مصمم ارادہ اور اپنی ذات پر بھروسہ رکھنے والے انسان کے راستے سے تمام موانعات کس طرح دور ہوجاتے ہیں لیکن یہ بالکل اُسی طرح ہے جس طرح ایک کم ہمت شخص اپنے اس خیال سے ہمیشہ ناکام رہتا ہے کہ یہ کام میرے لئے دُشوار ہے اور میں اسے کبھی نہیں کر سکتا۔

ایک مصمم ارادہ رکھنے والے شخص کو جسے نہ دُنیا کے ہنسنے کی پروا ہو اور نہ دلشکن و دلخراش تحریروں و تقریروں کا اندیشہ اُسے اُسکے مقاصد میں دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اُسے نہ غریبی ڈرا سکتی ہے، نہ بدبختی اور سخت سے سخت محنتیں اپنے مقصد سے ایک بال برابر ہٹا سکتی ہیں، چاہے جتنی سخت مُصیبتیں بھی کیوں نہ آئیں مگر اُسکی نظریں اپنے مقصد سے کبھی نہیں ہٹتیں اور فاتحانہ انداز سے برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

تم ایسے نوجوان کے متعلق کیا رائے قائم کروگے جسکا مقصد تو یہ ہو کہ وہ ایک قانون داں وکیل بنے مگر عمل اسکے خلاف ہو یعنی وہ بجائے قانونی کتابوں کے طبی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہو۔

یقیناً تم کہو گے کہ وہ اپنی اس موجودہ روش پر چل کر کبھی بھی وکیل نہیں بن سکتا بلکہ وکیل بننے کے لئے اُسے قانونی فضا میں رہنے کی ضرورت ہے۔ اور ایک ایسے استغراق و کامل محویت کی کہ اُسکے تمام احساسات پر قانون چھا جائے اور جو سانس بھی نکلے وہ قانون سے خالی نہ ہو۔

اسی طرح اُس شخص کے لئے اپنے مقاصد میں کامیابی کی اُمید نہیں کیجا سکتی جو ہمیشہ شکست و ناکامی ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہو اور جس نے ایک شکست خوردہ و ناکام شخص کی طرح چال، لباس اور خیالات، اختیار کر کے اپنے وجود کو حقیر سمجھ لیا ہو اور راستے کی مشکلات کو ایک نہ ختم ہونیوالا سلسلہ سمجھکر ہمیشہ شکایت کیا کرتا ہو

اکثر ناکامی کا آغاز وہیں سے شروع ہوجاتا ہے جہاں سے انسان اپنی قابلیت اور خود اعتمادی پر شک کرنے لگتا ہے کیونکہ اپنے وجود کو حقیر سمجھنا گویا اپنے آپ کو دشمن کے قبضے میں دیدینا ہے، جس وقت انسان نے اپنی کمزوری اور قابلیت کی کمی محسوس کی اسی وقت اُس نے اپنی خودداری و خود اعتمادی کی خوشنما عمارت کو متزلزل کر دیا اور تمام آیندہ بنیادوں کو اپنے ہاتھوں سے کھود ڈالا۔

اس لئے کہ اگر تم ایسے لوگوں میں رہو جو اپنے مقصد میں ناکام، بددل اور مایوس ہوچکے ہوں تو یقیناً تھوڑے عرصے میں تم بھی ایک ناکام شخص کی طرح زندگی بسر کرنے لگو گے لیکن اگر تم اپنا رُخ بدل دو اور ناکامی و کم ہمتی کے تمام خیالات کا رشتہ منقطع کردو، تو تمہارے یہ جوصلے اور مستقل کوششیں ضرور ایک دن تمہیں گوہر مقصد سے ہم آغوش کردینگی اور تم دیکھو گے کہ تمہارے گرد و پیش کی تمام چیزوں میں ایک نمایاں انقلاب ہوگیا ہے، یعنی اُس وقت تم جس چیز کو دیکھو گے اور جس چیز کے حاصل کرنیکا خیال تمہارے دل میں گذریگا تم اپنے آپ کو اُس سے بہت نزدیک پاؤ گے۔

"اپنے آپ بھروسہ کرو" یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ایک نازک دل بھی لوہے کی سخت زنجیر کو ہلا سکتا ہے۔

میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو مہینوں کسی نوکری کی تلاش میں مسلسل دوڑتے ہیں اور کامیاب نہیں ہوتے، جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ دفتر جانے سے پہلے ہی اُنکی ہر ہر حرکت سے اپنے اوپر بے اعتمادی کا اظہار ہوتا ہے، اُنکی مایوسیاں لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی اُنکے سروں کو اطاعت کے لئے جھکا دیتی ہیں اور وہ غریب خود اپنے خلاف گواہی دینے کی زندہ مثال ہوتے ہیں۔

جب تم اپنی نوکری کے لئے کسی سے درخواست کرتے ہو اور وہ تمہارے مایوس چہرے سے یہ عبارت پڑھ لیتا ہے کہ "جناب براہ کرم مجھے کوئی جگہ دیدیجئے، تقدیر میرے خلاف ہے میں مایوس اور ایک بدبخت کُتا ہوں لہٰذا مجھے اپنے در سے نہ دھتکاریئے" تو بجائے ہمدردی کے تمہیں نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھیگا اور اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیگا کہ تم انسان ہی نہیں ہو جسکے ہاتھ میں کوئی ذمہ داری کا کام دیا جا سکے، یہی نہیں بلکہ وہ تم سے جہانتک جلد ہو سکے گا علٰحدہ ہونے کی کوشش کریگا۔

ہاں اگر تمہیں کسی نوکری کی تلاش ہے تو اپنے گھر سے ایک فاتح کی حیثیت سے باہر نکلو، اور اپنے

پختہ یقین، شاندار خود اعتمادی سے اپنے مخاطب پر یہ ثابت کر دو کہ اُسے اپنے کام کیلئے جس طرح کے آدمی کی تلاش ہے وہ تم ہی ہو۔

ذاتی اعتماد، انسان کیلئے ایک حقیقی قوت اور ایک سچے دوست کی طرح اُسکا صحیح قائم مقام ہے، جس کے سامنے خاندانی افتخار، ذاتی وجاہت اور دولت کی فراوانی کوئی چیز نہیں، یہی وہ طاقت ہے جو بڑے سے بڑے موانعات اور اہم سے اہم مشکلات پر غالب آجاتی ہے۔

میں ایسے بہت سے سُست اور کم ہمت لوگوں سے ملا ہوں جو اپنی سُستی کی وجہ سے قیمتی موقعوں کو چھوڑ دیتے ہیں جن سے بہت کم قابلیت کے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں اور جب ان سے اس کا سبب پوچھا جاتا ہے تو وہ اس قسم کے جملوں سے اپنی کم ہمتی کا اقرار کرتے ہیں۔

"ہمیں اپنی ذات پر بھروسہ نہیں ہمیں کسی کام کے شروع کرنے میں اس لئے خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے اور ہمیں ذلت نصیب ہو، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ہم ایک دور دراز مقام پر اپنی جد جہد میں کامیاب ہو سکتے ہیں، ہمیں انتظار کرنا چاہیئے شاید کوئی اچھی جگہ ہمیں خود تلاش کرے یا ہم خود اُس کے لئے اچھی طرح تیار ہو جائیں"

یہی خوف، بزدلی اور غیر مطمئن خیالات کامیابی کیلئے بہ نسبت حقیقی ناقابلیت کے زیادہ خطرناک دشمن ثابت ہوتے ہیں اور انسان کی خود اعتمادی کو مجروح و برباد کر دیتے ہیں،

بخلاف اسکے وہ شخص جو اپنے ہاتھ میں لالٹین لئے ہُوئے چل رہا ہے اُسکی روشنی خواہ کتنا ہی اندھیرا کیوں نہ ہو ہمیشہ دوسرے قدم کی رہنمائی کرتی رہیگی اور وہ کبھی مسافت کی دوری کا خیال نہ لائیگا، بلکہ اپنے ہر قدم کو ایک مستقل منزل سمجھتا رہیگا،

لڑکیوں کے کالج کا ایک معلم طبیعات کہتا ہے کہ ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ہم لڑکیوں میں خود اعتمادی کا مادہ پیدا کریں تاکہ وہ اپنے مقصد کے انجام پر نظر رکھیں اور ذرایع حصول سے قطع نظر کریں، وہ انہیں بتاتا ہے کہ جسمانی قوت سے بھی زیادہ بڑی ایک قوت ہے اور وہ دماغی ہے جو اکثر سخت سے سخت تشویشناک موقعوں پر حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے،

یہ مسلّم ہے کہ اگر ہمکو اپنی امکانی طاقتوں کا احساس اور اپنی ذات پر کامل اعتماد ہو جائے تو ہم بہت زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے کاموں کی تکمیل کر سکتے ہیں، مگر ہم اپنے انہیں پُرانے خیالات میں پڑے ہُوئے ہیں

کہ انسان ایک ناچیز اور خاک میں مل جانے والی مخلوق ہے اور یہ نہیں جانتے کہ اُس میں کوئی ایسی ناقابلیت اور کمی نہیں ہے جسے خدا نے اُس میں ودیعت کیا ہو اُس کی بنائی ہوئی ہر چیز کامل و مکمل ہے ہاں اگر ہمیں کسی چیز کی کمی نظر آتی ہو تو یہ ہماری ناقابلیت کا نتیجہ ہے، بہت سے لوگ اس بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں کہ وہ بجائے اُسکے کہ خدا کی ودیعت کردہ قوتوں سے کام لیں اُسکی توہین کرتے ہیں چنانچہ ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک گریجوٹ جو عرصہ ہوا کالج چھوڑ چکا تھا اپنے متعلق لکھتا ہے۔

"مجھے چونکہ اپنی ذات پر اعتماد نہ تھا اس لئے میں کبھی ایک ہفتے میں بارہ ڈالر سے زیادہ نہ کما سکا"

اسی طرح پرنٹس یونیورسٹی کے ایک گریجوٹ نے مجھ سے بیان کیا کہ "ایک قلیل مدت کے علاوہ میں کبھی اس قابل نہ ہوا کہ ایک دن میں ایک ڈالر سے زیادہ پیدا کر سکتا"

ان کی ناکامی کا اصلی سبب سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کا پوری طور پر احساس نہ کیا اور اُنکی بزدلی اور ذاتی حقارت نے اُنکی قابلیت کو تباہ و برباد کر دیا۔

اسی طرح کی مصیبت کا سامنا اُن لوگوں کو بھی کرنا پڑتا ہے جو لپنے اوپر بھروسہ نہیں کرتے۔

سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنی طاقتوں کا کبھی احساس نہیں کیا حالانکہ انسان صرف اسی لئے بنایا گیا ہے کہ وہ ایک کامیاب فاتح کی حیثیت سے اپنے سر کو بلند رکھے اور خدا کی ودیعت کردہ طاقتوں کو اپنا پیدائشی حق خیال کرے "اس لئے کہ اپنی حقارت کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے" اگر تم بڑے بننا چاہتے ہو تو ہمیشہ اپنے دماغ کو بلند خیالات سے معمور رکھو چنانچہ ایک اعلےٰ قابلیت رکھنے والا اپنا قصہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح اُس نے ایک موقعہ پر شرم و ہچکچاہٹ کی وجہ سے قابلیت کو چھپا کر لوگوں پر اپنی ناقابلیت اور ذاتی غیر اعتمادی کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں جب اُس نے اپنے متعلق اس حقارت آمیز خیال کو بدل دیا اور اپنی عزت کے ساتھ اپنے آپ پر اعتماد کرنے لگا، اسی تاریخ سے گویا اُسکی کامیاب زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

اُس کا قاعدہ تھا کہ وہ روزانہ ایک خاص خودداری کے انداز میں ایسی سڑکوں اور ایسے مقامات پر جایا کرتا جہاں اُسے کوئی نہ جانتا تھا، وہاں وہ اپنے متعلق خیال کیا کرتا تھا کہ گویا میں اس شہر کا سردار یا ریاست کا گورنر یا یونائیٹڈ اسٹیٹس کا پریسیڈنٹ ہوں۔

جس وقت اُس نے خیال کیا کہ لوگ اُسے پہچانیں کہ وہ ایک دن ایک مشہور و نامور شخص ہو کر رہیگا اُسی وقت سے اُس کی ظاہری حالت ہی میں نہیں بلکہ تمام اعتقادات میں بھی ایک زبردست انقلاب ہو گیا اور اُس نے

محسوس کیا کہ ترقی ساتھ ہے اس خیال کا اثر اُس کی تمام قوتوں پر اندازے سے زیادہ پڑا ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ سڑک پر چلتے ہُوئے وہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے بچانیکی کوشش کرتا تھا اور اپنے اوپر کسی کی غائر نظریں پڑتے ہُوئے دیکھ کر خوف سے کانپ جاتا تھا، اب وہی نہایت آزادی کے ساتھ اپنی بزرگی اور ظاہری کمالات کی طرف لوگوں کو غور سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اس لئے کہ اب وہ ایک ایسی حالت میں ہے جس میں لوگ اُسے دیکھنے کے آرزومند رہتے ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے اپنی خداداد قوتوں کا مشاہدہ کر لیا ہے اور حقیقی طور پر اپنی بزرگی اور عزت محسوس کر لی ہے،

"اسکا یقین رکھو کہ تمہاری کامیابیاں اس وقت بلندی نہیں حاصل کر سکتیں جب تک تم میں خود اعتمادی نہ ہو" دُنیا کا ایک زبردست عکاس بھی حضرت مریمؑ کی تصویر اس وقت تک نہیں بنا سکتا جب تک کہ اُس کے دماغ میں سطحی خاکہ چکر کھا رہا ہو،

"اسی طرح تم اس وقت تک ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ ایک ناکام شخص کے سے خیالات اور اپنی ذات کے متعلق شکوک نہ نکالدو" اسکے لئے دماغ کو ہمیشہ خوشی اور کامیابی کے خیال سے معمور رکھو اور جو تصویر بھی دیکھو وہ خوشی اور فتح کی دیکھو، یہ چیزیں تمہارے شکوک اور خوف کو مٹا کر تم میں ایک ایسی طاقت پیدا کر دینگی کہ تم ایک کامیاب اور فاتح انسان بن جاؤ گے،

اس کی کبھی پروا نہ کرو کہ تم کس قدر غریب اور مفلس ہو، بلکہ بہادری کے ساتھ عسرت و غربت کی تمام تکالیف پر غالب آنے کی کوشش کرو اور کبھی اپنی عزت و بزرگی کا خیال دماغ سے نہ جانے دو،

اس بات کا یقین کے ساتھ خیال رکھو کہ تم اپنی تمام گرد و پیش کی چیزوں پر حکومت کرنیکے لئے پیدا کئے گئے ہو اور وہ تم ہی ہو جو اپنی ضروریات کے آقا ہو نہ کہ غلام۔

اس قسم کی بزرگی، طاقت اور اپنی اعلیٰ قابلیت کے خیال سے یہی نہیں کہ انسان ہر کامیابی کو اپنا مستقل پیدائشی حق سمجھنے لگتا ہے، بلکہ یہ اُسے ایک کامل انسان بنا کر اسکے شک اور بے اعتمادی کے خیال کو مٹا دیتا ہے اور اُسکی منتشر طاقتوں کو ایک مرکز پر لاکر متحد اور اپنے سے بھی زیادہ قوی کر دیتا ہے،

خود اعتمادی تمام قابلیتوں کی رہنما ہے جو محدود قوتوں کو ایک زبردست طاقت میں تبدیل کر کے خیال میں پختگی اور راسخ الاعتقادی پیدا کرتی ہے جس سے ہم دوسروں کی نظروں میں قابل اعتماد بن سکتے ہیں، دُنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جو اس کی معجزنما طاقت سے انجام نہ پا سکے، ایجاد، صنعت اور اکتشافات سب اسی کے سحر طراز کرشمے

ہیں، موجد، محقق، سڑکیں اور شہر کی تعمیر کرنے والوں کے دماغ میں یہی راسخ الاعتقادی اپنا کام کر رہی تھی،
سائنس اور جنگ میں ہزاروں فتوحات اسی کی ہیں جو ایک کم ہمت اور اپنی ذات پر شک کرنیوالے کے نزدیک محال تھیں،

وہ کام جو دوسروں کی نظروں میں مشکل نظر آتا ہے اگر تم اُسکے کرنیکا پوری طور پر ارادہ کرو تو اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم میں کام کرنیکی کوئی خاص طاقت موجود ہے۔

بہت سے لوگ جن کے شاندار کارنامے ہمارے سامنے ہیں اپنی راسخ الخیالی کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے اور نہ وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کونسا مضبوط خیال تھا جس کی بناء پر وہ جس کام کو چاہتے تھے انجام تک پہنچا دیتے تھے، لیکن نتیجہ اس بات کا شاہد ہے کہ اُنکے اندر کسی ایسی محفوظ طاقت کی جھلک موجود تھی جو اُنکے خیالات اور مضبوط ارادوں کو قائم رکھتی تھی اور وہ ہمیشہ آگے بڑھتے چلے جاتے تھے،

اکثر جب اُنکے مضبوط ارادوں کے سامنے اُمید کی کوئی جھلک نہ ہوتی تھی اس وقت بھی وہ کہا کرتے تھے کہ "ہم ضرور کامیاب ہونگے" اس لئے کہ یہ اُن سے ان کا پختہ خیال کہتا تھا اور یہ خیال اُنکے اندر ایک خداداد بات تھی جو محدود چار دیواریوں سے گزر کر لامتناہی سلطنت میں داخل ہو چکا تھا،

جب ہم اپنے اوپر اعتماد کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا شروع کرتے ہیں تو گویا اپنے خیال کی طاقتوں کو مدد پہنچاتے اور اُن کی تربیت کرتے ہیں جو ہمیں اُن کاموں کو اختتام تک پہنچانے کے قابل بنا دیتی ہیں جو ہم نے اختیار کئے ہیں خیال کی پختگی ہمارے کاموں میں مدد کرتی ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر دماغ کی یکسوئی کے لئے اور کوئی دوسری چیز نہیں،

وہ لوگ جن کی آج دنیا میں یادگاریں موجود ہیں اُن میں سے اکثر کامل طور پر اپنے مضبوط ارادوں۔ اور راسخ الخیالی کا اُس وقت بھی اتباع کرتے تھے جب انکے سامنے امید کی کوئی جھلک نہ ہوتی تھی اور یہی خیال ہوتا تھا جو خطرناک اور دقت طلب ویرانوں میں اُنکی رہنمائی کرتا ہوا اُنہیں منزل مقصود تک پہنچا دیتا تھا، بسا اوقات تاریکی میں بھی جبکہ ہمیں آگے کوئی روشنی نہیں دکھائی دیتی یہی خود اعتمادی ہماری رہنمائی کرتی ہے،

خود اعتمادی ایک خداداد طاقت ہے جو کبھی غلط راستے پر نہیں چلاتی اور ہمارے خیالات کو پختہ کر کے غیر محدود ممکنات اور طاقتوں کا دروازہ کھولدیتی ہے۔ غرضیکہ یہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہم کامل طور پر بھروسہ کرسکتے ہیں کہ یہ ہماری غلط رہنمائی نہ کریگی،

مصمم ارادہ اور کامل یقین، شک، خوف اور بے اعتمادی کو جو انسان کی کامیابی کے سب سے بڑے دشمن اور سدراہ ہیں تباہ و برباد کر دیتا ہے، اس سے کمزوری اور کم ہمتی سے پیدا ہونے والے ہزاروں موانعات دور ہو جاتے ہیں،

یقین، کامل اعتقاد کا جز لاینفک ہے جو خدا کی دی ہوئی سب سے بڑی طاقت ہے اور جس سے ہم ضروریات زندگی کا احساس کر سکتے ہیں +

غریبی و ناکامی کو ہم خود دعوت دیتے ہیں، اور بعض تو اس خیال ہی سے کانپا کرتے ہیں اُن کے پاس مفلسی و تباہی اکثر آیا کرتی ہے،

اس قسم کی پریشانی اور فکر انکی دماغی طاقتوں کو کمزور اور قوت متخیلہ کو اس قدر کند کر دیتی ہے کہ پھر ٹھیک طور پر وہ اُسکی تہذیب نہیں کر سکتے،

ناکامی کا خوف اور ناقابلیت کا احساس کسی شخص کی ناکامی کے دو بڑے سبب ہیں، بعض اعلیٰ قابلیت رکھنے والے اکثر معمولی درجے کی کامیابی حاصل کرتے ہیں اور بعض بالکل ہی ناکام رہتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنی قابلیت کو محدود کر دیتے ہیں اور کبھی مستقبل کی طرف غور کرنے کی فکر ہی نہیں کرتے،

وہ اپنی قابلیت کو محدود کر کے خود اپنے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں، جس سے اُنکی ناکامی کی بہت پہلے سے پیشینگوئی کی جاسکتی ہے، کیونکہ اُنکی گفتگو بجائے بلند ہونے کے پست ہو جاتی ہے، کاموں سے دلشکستہ ہو جاتے ہیں اور اُنکی طاقتیں ادنےٰ درجے کی رہ جاتی ہیں،

"خیالات، طاقت ہیں اور مضبوط ارادوں کا قیام انسان کا فطری حق" جو اُسکی مایوسانہ حالت اور غیر مطمئن و خلاف ماحول کو حسب منشا، تبدیل کر دیتا ہے،

اگر تم اپنی کامیابی کا پوری طور پر یقین کر لو، تو بہت جلد تم اپنے لئے ایک کامیاب فضا تیار کر سکتے ہو، جہاں کی تمام چیزیں خود بخود تمہاری طرف کھینچنگی اور تم اپنے ماحول کے لئے ایک چقماق ثابت ہو گے،

کیا تم کسی چیز کی تبدیلی کی امید کر سکتے ہو جبکہ محض تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوئے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ خود بخود متغیر ہو جائے، اسکی مثال بالکل اس طرح ہے جس طرح کہ تم کسی تعمیر کی بُنیاد پر بیٹھ کر یہ چاہو کہ اُسکی عمارت بن کر تیار ہو جائے غالباً تم کبھی ایسی امید نہ کرو گے، کیونکہ محض کسی چیز کی خواہش کامیابی کا ذریعہ نہیں بن سکتی جبتک کہ یقین اور مصمم ارادے سے اسکو مکمل نہ کیا جائے،

ایک مرتبہ ویبسٹر کا باپ ڈینل کی اس حرکت سے سخت ناخوش اور رنجیدہ ہوا کہ اُس نے "نیو ہمپ شائر"

(new Hampshire) کی ماتحت عدالت کی پندرہ سو ڈالر کی محرری سے انکار کر دیا جس کے لئے اُس نے کالج چھوڑنے کے بعد سخت محنت کی تھی،

چنانچہ اُس نے "ڈینیل" "Daniel" سے پوچھا کہ کیا تم اس عہدے کو قبول نہ کرو گے،

ڈینیل نے جواب دیا بیشک! مجھے امید ہے کہ میں اس سے بہتر کوئی اور کام کرونگا۔ میں دوسروں کے کاموں کے رجسٹر رکھنے کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

اپنی ذات پر "کامل بھروسہ" کسی بڑے شخص کی طرح طرزِ عمل اختیار کرنے میں ایک بہت بڑا معاون ہے،

ہر بچے کو اُمید کرنیکی تعلیم دینا چاہیئے تاکہ وہ اس بات کا یقین کرلے کہ میری پیدائش صرف فتوحات کیلئے ہے،

بچوں کو بیوقوف و سُست کہنا یا اُنہیں دوسرے بچوں سے کم بتانا، والدین اور اساتذہ کا سخت ظلم ہے کیونکہ اس سے وہ بجائے اپنے اوپر بھروسہ کرنے اور کامیابی کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے کے اُس سے مایوس اور بددل ہوجائیں گے،

ہر بچے کو بڑے سے بڑے کام کرنیکی تعلیم دینا چاہیئے تاکہ وہ کامل یقین کے ساتھ خدا کی ودیعت کردہ طاقتوں کو جان لے اور دُنیا میں اپنے زرّیں کارنامے چھوڑنے کی کوشش کرے۔

بغیر خود اعتمادی اور مضبوط ارادے کے انسان محض قسمت کا کھلونا یا ایک ایسی کٹ پتلی بن جاتا ہے جو ضروریات کے اشاروں پر ناچتی ہے، اس لئے بچپن ہی میں ایسا بیج بونا چاہیئے جو اُسے جوانی میں ایک فاتح بنادے،

اگر تم ایک شریف آدمی بننا چاہتے ہو تو کبھی اپنی ذلت کے احساس سے نہیں بن سکتے، مثلاً یہ خیال کرنا کہ ہم اُتنے ذی عزت نہیں جتنے کہ دوسرے لوگ ہیں، یا ہم اس کام کے قابل نہیں ہیں یا یہ کہ ہم اُسے نہیں کرسکتے "یہ نہیں کا فلسفہ" تمہیں ذلیل و معطل کردیگا، اور کبھی تم ایک باوقار انسان نہ بن سکو گے،

اگر تم دنیا میں عزت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے سر کو بلند رکھو اور ہمیشہ اپنے دل میں کہتے رہو کہ "ہم کوئی فقیر، مفلس یا ناکامیاب انسان نہیں ہیں" بلکہ ہم بادشاہ ہیں شہزادے ہیں اور کامیابی ہمارا پیدائشی حق ہے" اور اس سے ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت محروم نہیں کرسکتی،

اپنی عزت آپ کرنا، کوئی معمولی اور غیر شریفانہ بات نہیں بلکہ یہ ایک پاک جذبہ ہے: جو شخص اپنی عزت آپ کرتا ہے گویا اُس نے خدا کی غیر محدود طاقتوں کی جھلک دیکھ لی ہے، خدا نے ہمیں ایک

کامل انسان کے خیال سے بنایا ہے نہ کہ ایک غیر مکمل انسان کے خیال سے جو کہ اپنے چاروں طرف ناکامی اور ذلت دیکھتا ہو،

جب ہم نے اپنی غیر فانی طاقتوں کا احساس کر لیا تو گویا اُن ممکنات کو دیکھ لیا جنہیں کبھی خواب میں بھی نہ دیکھ سکتے تھے،

جب ہم اپنی حقیقت کو پوری طور پر جان لینگے تو ہمارے ارادے ایک ایسے رشتے سے منسلک ہو جائینگے جو طاقتوں کا خزینہ ہے جس کے بعد ہم کبھی مغلوب نہ ہو سکینگے،

(ترجمہ) سید ابو محمد ثاقب کانپوری

علامہ چانکیہ کے اقوال

۱- ایک عقلمند شخص میں جملہ اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں لیکن ایک احمق شخص میں سوا حماقت کے کوئی شئے نہیں پائی جاتی ـــــ اس لئے ایک عقلمند آدمی صدہا احمقوں سے بہتر ہے ـــــ !!!

۲- قمر ستاروں کے لئے ایک بیش بہا زیور ہے۔ اُسی طرح بادشاہ اپنی رعایا کے لئے ایک خوبصورت نازک زیور ہے۔ مگر عالم متبحر جملہ عالمیان کے لئے زیور ہے۔ !!!

۳- والدین اُس لڑکے کے حق میں دشمن ثابت ہوتے ہیں جسے وہ تعلیم نہیں دلاتے ہیں !!!

۴- جاہل کا وجود علمائے متبحر کی مذاکرعلمیہ کی مجلسوں میں ایسا ہی ہے جیسے ایک حسین شخص کے پاس کوئی حبشی بیٹھا ہو !!!

۵- والدین کو لڑکے کی اُسکے پانچویں برس تک ناز برداری کرنا چاہیئے اسکے بعد کی عمر سے ۱۵ سال تک نہایت سختی سے کام لینا چاہیئے اور سولھویں برس کے بعد سے مثل دوست کے برتاؤ کرنا چاہیئے!!!

۶- والدین کو ۱۶ برس کے بعد اس کا موقع لڑکے کو نہیں دینا چاہیئے کہ اُسکو غصہ آئے۔ کیونکہ اُس وقت وہ مثل ایک دہکتی ہوئی آگ کے ہوتا ہے اگر اُس میں ہوا دی گئی تو وہ اور بھڑکیگا !!!

محمد مشیر احمد علوی کاکوری (علیگ)

(جے۔ ای۔ سی)

کلامِ شرف

(میرزا وقار الاعظم شرف جاوره)

ہم دیر و کلیسا میں کیوں خاک اُڑاتے ہیں
آنکھیں ہوں تو سب جلوے دل میں نظر آتے ہیں

اس درد محبت کو سو کھیل کھلاتے ہیں
چھُٹتا ہے جو پہلو سے سینے سے لگاتے ہیں

جب موت کہے ہر دم انسان سے ہم آغوشی
کیوں مجھکو مرے عقدے مشکل نظر آتے ہیں

نظارۂ جاناں نے کیا ظُلم کوئی توڑا
آئینۂ حیران کے دیدے پھٹے جاتے ہیں

اس زیست کے سودے میں آنا ہے نہ کچھ جانا
پایا ہُوا کھوتے ہیں کھویا ہُوا پاتے ہیں

مُردوں کا جلانا تو دستور میں داخل ہے
ہے اُنکو مزہ اس میں جیتوں کو جلاتے ہیں

تم شمعِ تمنا ہو میں شمع پہ پروانہ
انگارے تو دشمن ہیں وہ آگ لگاتے ہیں

کہتا ہوں ہیں کیا اُن سے کیا مُنہ سے نکلتا ہے
ادسان مُصیبت میں آئے ہُوئے جاتے ہیں

اے بادِ صبا کہنا تم بھُول گئے ہم کو
تم بھُول گئے ہم کو ہم یاد دلاتے ہیں

جب دیکھئے آئینہ یہ کھیل نہیں اچھا
اتنے سے کلیجے پر کیا تیر چلاتے ہیں

چاہا جو شرف اُنکو یہ قدر ہُوئی اپنی
کل پاس بٹھاتے تھے اب دُور بٹھاتے ہیں

غزل

کیا رہ کے کرے بلبلِ ناشاد چمن میں
اب آٹھ پہر رہتا ہے صیّاد چمن میں

دم بھرتے ہیں تیرا ہی جوانانِ چمن بھی
سُنتا نہیں کوئی مری فریاد چمن میں

گلگشتِ چمن خانۂ صیّاد ہے مجھ کو
روتا ہوں کہ آتی ہے تری یاد چمن میں

اے موسمِ گُل میں بھی ترے ساتھ ہی چلتا
رہنے نہیں دے گا مجھے صیّاد چمن میں

نسبت ہی نہیں تم سے مجھے اہلِ چمن کچھ
پابندِ قفس ہوں میں۔ تم آزاد چمن میں

کیا بلبلِ ناشاد پہ ٹوٹی ہے قیامت
برپا ہے یہ کیوں؟ محشرِ فریاد چمن میں

اے سیفی وارفتہ ذرا دیکھ تو چل کر
ہر پھُول ہے اِک شوخ پریزاد چمن میں

(ابو الاعجاز سیفی سہوارَوی)

تصویرِ شباب

مصنفۂ آسکر وائلڈ —————— مترجمہ محمد ہادی حسین

بقیۂ باب اوّل

لارڈ ہنری نے اپنی نوکدار بھوری ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے اور اپنی ساگوان کی چھڑی کو آہستہ آہستہ بوٹ کی نوک پر مارتے ہُوئے کہا "باسل! ہو تم پُورے انگریز! یہ دوسری بار ہے کہ تم نے یہ بات کہی ہے۔ اگر کسی انگریز کے سامنے کوئی نیا خیال پیش کیا جائے تو وہ کبھی یہ سوچنے کی تکلیف نہ گوارا کریگا کہ یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔ اُس کے نزدیک اگر کوئی بات کچھ اہمیت رکھتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اُس کے پیش کرنے والے کو خود اس کا یقین ہے یا نہیں۔ حقیقت میں کسی خیال کی صحت کو متکلّم کے دلی یقین سے کچھ مناسبت نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے اس بات کا بہت امکان ہے کہ متکلّم کو کسی خیال سے جتنا کم تعلق خاطر ہوگا، اُتنا ہی زیادہ وہ معقول ہوگا کیونکہ اُس حالت میں وہ اُس کی ضرورتوں خواہشوں یا تعصّبوں کے رنگ میں رنگا ہُوا نہ ہوگا۔ خیر میں تم سے سیاسیات، معاشیات، یا مابعد الطبیعیات کی بحث چھیڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں اشخاص کو اصولوں سے زیادہ پسند کرتا ہوں، اور ایسے شخصوں کو تو میں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ چاہتا ہوں جو اُن سے یک قلم بے نیاز ہوں۔ کہو، تم سے اور مسٹر ڈورین گرے سے کتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوتی ہے؟"

"ہر روز۔ میں اُس سے دن میں ایک مرتبہ نہ ملوں تو خوش نہیں رہ سکتا۔ اُس سے ملے بغیر مجھے چارہ نہیں۔"

"کیسی عجیب بات ہے! میں سمجھتا تھا کہ تم اپنی صنعت کے سوا کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔"

مصوّر نے سنجیدگی سے جواب دیا "اب اُس کی ذات میرے لئے اپنی تمام صنعت کی مترادف ہے میں کبھی کبھی خیال کیا کرتا ہوں کہ دُنیا کی تاریخ میں دو دَور جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اول صنعت کے کسی نئے وسیلۂ اظہار کی ایجاد۔ اور دوسرے صنعت کے لئے کسی نئی شخصیت کا ظہور میں آنا۔ رنگسازی کی ایجاد اہلِ وینس کے لئے جو معنی رکھتی تھی۔ وہی معنے انطینوس کا چہرہ یونانی بُت تراشوں کیلئے رکھتا تھا، اور وہی معنی کسی دن ڈورین گرے کا چہرہ میرے لئے رکھیگا۔ اُسے میری صنعت سے اسی قدر رابطہ نہیں ہے کہ میں اُسکے خدوخال

کا خاکہ اُتارتا ہوں، اور اُس کے چہرے کے رنگ و روغن سے اُس میں رنگ بھرتا ہوں بیشک میں یہ سب کچھ کر چکا ہوں لیکن فی الاصل وہ میرے لئے صنعت کے ایک معمولی پیش نہاد یا نمونے سے کہیں زیادہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں اُسے حسبِ دلخواہ اپنی صنعت میں منعکس نہیں کر سکا، یا اُس کا حُسن ایسا ہے کہ صنعت اُس کی نقل اُتارنے سے قاصر ہے۔ موجودات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو صنعت کی قدرتِ اظہار سے باہر ہو۔ اور میں یہ جانتا ہوں کہ جب سے میں ڈورین گرے سے ملا ہوں میں نے بہت کچھ کام انجام دیا ہے، جسے میں اپنی زندگی کا بہترین کام کہہ سکتا ہوں۔ مگر اُس کو میری صنعت سے صرف یہی دُور کا تعلق نہیں۔ ایک عجیب طریقے سے، ایک ایسے عجیب طریقے سے کہ میں حیران ہوں تمہیں کیونکر اپنا مطلب سمجھاؤں، اُسکی شخصیت نے مجھے ایک نیا انداز سمجھایا ہے، ایک بالکل اچھوتا انداز۔ میں اب چیزوں کو اَور ہی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، اور اُن میں مجھے کچھ اَور نظر آتا ہے۔ اب میں ایک ایسے طریق سے زندگی کو از سرِ نو خلق کر سکتا ہوں جو پہلے میری نگاہوں سے پنہاں تھا۔ "تخیل کے خوابوں میں ایک طلسم اشکال"! میں بھولتا ہوں کہ یہ کس کا قول ہے، لیکن ڈورین گرے میرے نزدیک ہُوبہُو یہی ہے۔ اس لڑکے کا فقط میری آنکھوں کے سامنے ہونا ——— میں اُسے لڑکا کہتا ہوں حالانکہ وہ بیس سال سے زیادہ عمر کا ہوگا ——— ہاں، اُس کا فقط میری آنکھوں کے سامنے ہونا، میں متعجب ہوں کیا تم کبھی اس کا اندازہ کر سکتے ہو کہ یہ میرے نزدیک کس قدر معنی خیز بات ہے۔ غیر محسوس طور پر اُس نے میرے لئے صنعت کے ایک نئے مسلک کی داغ بیل ڈالدی ہے، اور وہ مسلک ایسا مسلک ہے کہ اُس میں جہاں رومانیت کی تمام قوتِ جذبات ہوگی وہاں یونانی صنعت کا کمالِ فن بھی ہوگا۔ جسم و رُوح کا اِتصال ——— اُف، وہ کیا شئے ہو سکتی ہے! ہم نے اپنی حماقت سے ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے، اور ایک طرف تو ایک ایسی واقعہ پرستی ایجاد کی ہے جس میں لکیر کی نقیری کے سوا کچھ نہیں رکھا، اور دوسری طرف ایک ایسی خیال آرائی جو حقیقت سے سراسر عاری ہوتی ہے۔ کاش، ہنری تم جانتے کہ ڈورین گرے میری نظروں میں کیا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا میں نے ایک مرتبہ ایک منظر کی تصویر کھینچی تھی۔ اُسکے لئے اگنیو مجھے کس قدر زیادہ قیمت دیتا تھا۔ مگر میں نے اُسکا بیچنا منظور نہ کیا۔ وہ میری بہترین تصویروں میں سے ہے اور اس کی وجہ جانتے ہو کیا ہے؟ یہی کہ جس وقت میں اُسے بنا رہا تھا، ڈورین گرے میرے پاس بیٹھا تھا۔ کوئی مخفی قوت اُس کی ذات سے میرے دل و دماغ میں نفوذ کر رہی تھی، اور عمر بھر میں پہلی بار میں نے جنگل کے پھولوں میں وہ اعجوبہ دیکھا جسے میری نظریں ہمیشہ ڈھونڈھتی تھیں اور نہ پاتی تھیں۔"

"باسل، یہ عجیب ماجرا ہے! دیکھنا چاہیئے وہ کون ایسا شخص ہے!"

ہالورڈ بنچ پر سے اُٹھا اور کسی سوچ میں غرق اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بنچ کے قریب آیا اور کہنے لگا "ہنری، ڈورین گرے میرے لئے صنعت کا ایک محرّک ہے۔ شاید تمہیں اُس میں کچھ نظر نہ آئے۔ میں اُس میں سب کچھ دیکھتا ہوں۔ حاضر و غائب وہ میری صنعت میں ہر وقت موجود ہے۔ بلکہ جب اُس کا وجود جسمانی میری صنعت میں نہیں ہوتا تو وہ اُس وقت اُس پر اور بھی زیادہ محیط ہوتا ہے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ وہ میرے لئے ایک نئے انداز کا سمجھانیوالا ہے میں اُسے بعض خطوط کے خم و پیچ میں، بعض رنگوں کی دلکشی اور نظر فریبی میں دیکھتا ہوں۔ اسکے سوا وہ میرے نزدیک کچھ نہیں"

لارڈ ہنری نے پوچھا "پھر تم اُس کی تصویر نمایش میں کیوں نہیں بھیجتے؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ بغیر کسی ارادے کے میں نے اس تصویر میں اپنی عجیب غریب مصورانہ صنم پرستی کا اظہار کردیا ہے اسکا ذکر میں نے کبھی اُس سے نہیں کیا۔ اُسے اس کا کچھ علم نہیں ہے اور نہ ہوگا۔ مگر دنیا شاید اس بھید کو پا جائے۔ اور میں ہرگز اپنی رُوح کو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے عریاں نہیں کرنا چاہتا۔ ہنری، اس تصویر میں میں نے اپنے کو بہت زیادہ نمایاں کردیا ہے"

"شاعر لوگ تمہاری طرح شکی نہیں ہوتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ جذبات اظہار کیلئے ہوتے ہیں اور وہ اُنکی اشاعت میں تامّل نہیں کرتے۔ پھر آجکل تو ٹوٹے ہوئے دلوں کی بہت مانگ ہے"

ہالورڈ نے کہا "مجھے اُن سے اس باعث نفرت ہے۔ صنّاع کو حسین اشیاء خلق کرنا چاہئیں۔ لیکن اُسکو اُن میں اپنی زندگی کا کوئی عنصر شامل نہ کرنا چاہیئے۔ فی زمانہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صنعت ایک طرح کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے۔ یہ اسی کا طفیل ہے کہ ہم میں حُسن کی مجرّد حس مفقود ہے۔ ہم اُسے ایک مادّی چیز سمجھنے لگے ہیں۔ کسی دن میں دُنیا کو بتا دونگا کہ حُسن کا حقیقی عرفان کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا ڈورین گرے کی تصویر سے محروم رہیگی"

میرا خیال ہے تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ مگر میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف وہ لوگ بحثا کرتے ہیں جن کے دماغ میں کچھ خلل ہوتا ہے۔ اس لئے اس ذکر کو چھوڑو اور مجھے یہ بتاؤ کیا ڈورین گرے تم سے خوب گھل مل گیا ہے؟"

مصوّر نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد جواب دیا "ہاں اُسے مجھ سے کچھ اُنس ہے" میں جانتا ہوں کہ اُسے مجھ سے کچھ اُنس ہے۔ میں اُسے خوش رکھنے کے لئے اُس کی خوشامد بھی بہت کرتا ہوں۔ معلوم نہیں مجھے اُس سے ایسی ایسی عجیب باتیں کہنے میں کیوں لطف آتا ہے، جنکے کہنے کا میں محسوس کرتا ہوں، مجھے بعد کو افسوس ہوگا۔ اُسے بھی میری خاطر بہت منظور رہے۔ اور ہم گھنٹوں اس کمرے میں بیٹھے باتیں کیا کرتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی

ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ میرے جذبات کا لحاظ نہیں کرتا اور ہر ایک ظالمانہ خوشی سے رہ رہ کر میرے دل کو چرکے لگاتا ہے۔ اُس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی روح ایک ایسے شخص کے سپرد کر دی ہے جو اُسے ایک پھول سمجھتا ہے کہ توڑا، اپنا جی بہلایا، اور نوچ ڈالا، یا اپنے شوقِ خود آرائی کو پورا کرنے کے لئے ایک زیور سمجھتا ہے، یا گرمیوں کے کسی دن کے لئے تفریح کا سامان،،

لارڈ ہنری نے دبی زبان سے کہا "باسل گرمیوں میں دن کاٹنا پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ شاید تم اُس سے پہلے مشغلے سے اُکتا جاؤ گے۔ بات تو بہت افسوسناک ہوگی، لیکن اسکو کوئی کیا کرے کہ حسن ناپائدار ہے، اور دماغی جوہر اُس کے مقابلے میں زیادہ دیر تک قائم رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم لوگ ضرورت سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی ایسا "اسم اعظم" ہاتھ آجائے جس کی بدولت ہم تنازع للبقا میں فنا ہونے سے بچ جائیں۔ اور اس لئے ہم بیکار معلومات کے ذخیروں کو کوٹ کوٹ کر اپنے دماغ میں بھر لیتے ہیں، اس موہوم اُمید پر کہ شاید اسی کے بل بوتے پر زندگی کی جد و جہد میں اپنی جگہ قائم رہ سکیں۔ زمانۂ حاضرہ کا منتہائے خیال جانتے ہو کیا ہے؟ —— وہ شخص جس کی معلومات کا دائرہ وسیع ہو۔ مگر ایسے شخص کا دماغ، کچھ نہ پوچھو کہ کیسا ہوتا ہے؟ بس یہ سمجھ لو کہ ایک کباڑی کی دوکان ہے، کہ ٹوٹی پھوٹی چیزوں اور خس و خاشاک سے اٹی پڑی ہے، اور طرفہ یہ کہ ہر چیز کی قیمت اُس کی اصلی قیمت سے زیادہ ہے۔ غرض میرا یہ خیال ہے کہ تمہارا جی اُس سے چند دنوں میں اُچاٹ ہو جائیگا۔ کسی دن تم اپنے دوست کو دیکھو گے تو تمہیں ایسا معلوم ہوگا کہ اُس کا ناک نقشہ ذرا مسخ ہو چلا ہے، یا اُس کا رنگ ذرا پھیکا پڑ چلا ہے، یا کوئی اور نقص تمہاری آنکھوں میں کھٹکنے لگیگا۔ بس پھر کیا ہے، تم اُسے دل ہی دل میں بُرا بھلا کہو گے اور متعجب ہو گے کہ اُس نے تمہاری آنکھوں پر کس طرح پٹی باندھ رکھی تھی۔ اُس کے دوسرے دن جب وہ آئیگا تو تمہاری ساری آؤ بھگت اور گرمجوشی سرد پڑ چکی ہوگی۔ یہ ہوگی بہت بُری بات، کیونکہ تم اسکے بعد بیحد بدل جاؤ گے۔ جو کچھ تم نے بتایا ہے واقعہ میں ایک پُر کیف افسانہ ہے، جسے ایک ،،افسانۂ صنعت،، کہا جا سکتا ہے، مگر افسانوں میں ایک خاصیت بہت بُری ہوتی ہے، کہ وہ انجام کار انسان کو نہایت بے کیف اور بدمزہ کر دیتے ہیں۔ یعنی اُن کے کیف کا خمار بہت کلفت انگیز ہوتا ہے،،

،،ہنری، ایسا کلمہ مُنہ سے نہ نکالو۔ جب تک میں زندہ ہوں، جبتک میرے حواس قائم ہیں، ڈورین گرے کی شخصیت میرے دل و دماغ پر حکومت کرے گی۔ تم میرے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ تمہاری فطرت میں بیحد تلون ہے۔،،

"۔۔۔ اسی وجہ سے تو میں تمہارے احساسات کو تم سے زیادہ سمجھ سکتا ہوں۔ جو لوگ فلک کے بندے ہوتے ہیں وہ ایک ادنیٰ درجے کی سطحی محبت سے آشنا ہوتے ہیں۔ محبت کے دردناک انجام کی حقیقت کچھ بیوفاؤں ہی پر کھلتی ہے"۔ یہ کہہ کر لارڈ ہنری نے چاندی کی ایک نفیس ڈبیہ سے ایک دیا سلائی نکال کر جلائی اور سگرٹ سلگا کر اس سکون اور دلجمعی سے پینے لگا گویا اُس نے اس ایک جملے میں کتاب حقیقت کا خلاصہ کر کے رکھ دیا تھا عشق پیچاں کی بیل کے چمکیلے سبز پتّوں میں چہچہاتی ہوئی چڑیوں کے پھُدکنے سے ایک خفیف سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اور بادلوں کی نیلی نیلی پرچھائیاں ابابیلوں کے جھُرمٹ کی طرح گھاس پر ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی تھیں۔ باغ میں عجب فرحت انگیز سماں تھا۔ لارڈ ہنری خاموشی سے اس منظر کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لوگوں کے محسوسات اس وقت اُنکے خیالات اور معقولات کی بہ نسبت کس قدر پُر لطف ہونگے! انسان کے لئے دو چیزیں صد درجہ کی دلکشی رکھتی ہیں ــــ اپنی رُوح اور اپنے دوستوں کے جذبات۔ لارڈ ہنری چُپکے چُپکے اُس بے مزہ دعوت کے تصوّر سے لُطف اندوز ہو رہا تھا جس میں شریک ہونیکی بجائے وہ اتنی دیر تک باسل ہالورڈ کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ اگر وہ اپنی پھوپھی کے ہاں جا کر دعوت میں شریک ہو جاتا تو یقینی امر تھا کہ وہاں اُسے لارڈ "گڈ باڈی" سے پالا پڑتا۔ اور وہ بیٹھے بٹھائے ایک ذہنی مجاہدے میں گرفتار ہو جاتا۔ دعوت کے دَوران میں گفتگو صرف محتاجوں کی پرورش اور اعلےٰ پیمانے پر سرائیں بنوانے کے متعلق ہی ہوتی۔ جتنے لوگ تھے سب باری باری اُن نیک کاموں پر وعظ کہتے جن کے کرنیکی خود اُن کو چنداں ضرورت نہیں۔ دولتمند کفایت شعاری کی تلقین میں اپنا سارا زورِ تکلم خرچ کر دیتے، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے والے عہدی محنت و مشقت کے فوائد پر تقریریں کر کے فصاحت کی داد دیتے۔ بہت اچھا ہُوا کہ وہ نہ گیا۔ ورنہ وہاں دماغ سوزی کے سوا کیا رکھا تھا؟ پھوپھی کا خیال کرتے ہی اُس کے دل میں کوئی نئی بات آئی۔ اُس نے ہالورڈ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "باسل، لو مجھے یاد آ گیا"۔

"کیا یاد آ گیا؟"

"کہ میں نے ڈورین گرے کا نام کہاں سُنا تھا"۔

ہالورڈ نے ایک خفیف سی شکن ماتھے پر ڈال کر پوچھا "کہاں سُنا تھا؟"

"یہ بے طرح شکن کس لئے؟ اپنی پھوپھی لیڈی اگاتھا کے ہاں اور کہیں نہیں۔ اُس کا تذکرہ یوں آیا کہ وہ اپنے رفاہ عام کے کاموں کے متعلق کچھ بیان کر رہی تھیں کہ اسی ضمن میں کہنے لگیں کہ "مجھے آج ایک

نہایت خوب آدمی ہاتھ لگ گیا ہے وہ ایسٹ اینڈ میں مجھے مدد دیگا۔ اس کا نام ڈورین گرے ہے۔" انہوں نے اسکی خوبصورتی کی نسبت کچھ نہیں کہا عورتوں کو حسن شناسی کا مذاق ہی کب ہوتا ہے؟ کم از کم نیک عورتوں کو نہیں ہوتا۔ انہوں نے مجھے اسی قدر بتایا کہ وہ صدق دل سے اس کام کیلئے تیار ہے اور اسکے حسن سیرت کی بہت تعریف کی۔ میں نے اپنے دل میں اس کا تصور یوں باندھا تھا کہ کوئی سڑیل مریل سا شخص ہے، چشمہ لگائے ہوئے، بکھرے ہوئے بال، چہرہ داغ داغ، بڑے بڑے گنواروں کے سے پاؤں گھسیٹتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ کیا خوب ہوتا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ شخص یہی تمہارا دوست تھا۔"

"اچھا ہوا کہ تمہیں معلوم نہ ہوا۔"

"کیوں؟"

"میں نہیں چاہتا کہ تم اس سے ملو۔"

"تم نہیں چاہتے کہ میں اس سے ملوں!"

"ہاں میں نہیں چاہتا۔"

اتنے میں خانساماں باغ میں داخل ہوا، اور ہالورڈ سے خطاب کر کے بولا "جناب، مسٹر ڈورین گرے تشریف لائے ہیں۔"

لارڈ ہنری نے ہنس کر کہا "لو اب تو اس سے میرا تعارف کرا دو۔"

مصور اپنے نوکر کی طرف متوجہ ہوا جو دھوپ میں کھڑا تیز روشنی کے باعث آنکھیں جھپک رہا تھا، اور بولا "پارکر، مسٹر ڈورین گرے سے ذرا دیر تک انتظار کرنے کو کہو۔ میں ابھی آیا۔"

پھر مصور نے لارڈ ہنری کی طرف دیکھ کر کہا "ڈورین گرے میرا عزیز ترین دوست ہے۔ وہ ایک بھولا بھالا نوجوان ہے۔ تمہاری پھوپھی نے جو کچھ اسکی نسبت کہا تھا سچ کہا تھا۔ دیکھو اسکو بگاڑ نہ دینا، اس پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارا اثر اسکے لئے مضر ہوگا۔ دنیا اس سے اچھے اچھے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ مجھ سے اس ایک شخص کو جو میری صنعت کی جان ہے جدا کرنیکی کوشش نہ کرنا، میری زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ یاد رکھنا، ہنری، مجھے تم پر اعتماد ہے۔" وہ نہایت دھیمی آواز سے بول رہا تھا اور الفاظ اسکے خلاف مرضی رک رک کر اسکے گلے سے نکل رہے تھے۔

لارڈ ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا "ہنری، تم بھی کیا واہیات بکتے ہو!" اور ہالورڈ کے بازو میں ہاتھ ڈال کر وہ اسے گھر کی طرف لے چلا۔

(باقی دارد)

محمد ہادی حسین

غزل

مولوی سید ضامن حسین گویا جہان آبادی

حاصلِ عشق؟ کبھی چاکِ گریباں ہونا ؛ کبھی خنداں، کبھی گریاں، کبھی نالاں ہونا"
گریۂ چشم و نظر ہے، مرا خنداں ہونا ؛ خندۂ زخمِ جگر ہے، مرا گریاں ہونا
تھا ازل سے مری تقدیر میں انساں ہونا ؛ یعنی اک پیکرِ صد حسرت و ارماں ہونا
میری تکمیلِ حقیقت میں ہے انساں ہونا ؛ یا ترا جلوہ گرِ محفلِ امکاں ہونا؟
میری ہر بات کا گویا کہ خلاصہ ہے "طلب" ؛ میرے ہر کام میں پنہاں مرا خواہاں ہونا
خاک ہو کر بھی سبکدوش نہ حسرت سے ہوئے ؛ حسرتِ خاک ہے، خاکِ درِ جاناں ہونا
رفتہ رفتہ مژۂ یار کا آفت ڈھانا ؛ ہوتے ہوتے نگۂ یار کا پیکاں ہونا
رونگٹا رونگٹا میرا ہے رگِ جاں کا رقیب ؛ وجہ اسکی، ترا نزدیکِ رگِ جاں ہونا
تیری بے پردہ تجلّی تیرے پردے کا سبب ؛ شہرۂ عام کا باعث ترا پنہاں ہونا
آخری حسرتیں اور موتِ غریب الوطنی، ؛ بیکسی اور مرا بے سر و ساماں ہونا
دل یہ کہتا ہے کہ اُٹھ جائے دوئی کا پردہ ؛ وہ یہ کہتے ہیں کہ اچھا نہیں عریاں ہونا
حال پر اپنے ہنسی آتی ہے، اللہ اللہ ؛ فرطِ غم سے ہمیں دشوار ہے گریاں ہونا
دل ہے مغموم تو ہر پھول ہے اک خار ہمیں ؛ اسکو کہتے ہیں گلستاں کا بیاباں ہونا
اور تو اور تصوّر ہے ترا ناممکن ؛ اِس طرح فکرِ نظر سے ترا پنہاں ہونا
ہر طرف یاس کی تصویر نظر آتی تھی ؛ دمِ آخر وہ مرا پیکرِ حرماں ہونا
وجہ عبرت ہے زمانے میں خوشی غم انجام ؛ سبق آموز ہے ہر پھول کا خنداں ہونا

وہ اگر چاک کریں میرا گریباں گویا!
کیوں نہ منظور ہو پھر چاکِ گریباں ہونا

گویا جہان آبادی

اخلاقیاتِ اجتماعیہ

گذشتہ سے پیوستہ

فرائض وحقوق کا تصادم ۔ یہ فرائض وحقوق بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم بھی ہو جاتے ہیں ۔ اس تصادم کو یوں سمجھو کہ ایک شخص اپنے دشمن کو قتل کرنیکے لئے تلوار خریدتا ہے اور اسے اسکی تلاش میں لئے پھرتا ہے ۔ تمہیں اسکی خبر لگتی ہے کہ اس کا ارادہ قتل کا ہے اور اس سے اُسے باز رکھنے کے لئے تم اس کی تلوار چھین لیتے ہو۔ تمہاری یہ حرکت اگرچہ احترام ملکیت کے خلاف ہے کیونکہ تلوار اسکی ملک تھی اور اسے رکھنے کا اسے حق تھا، مگر احترام حیات کا عین منشا یہی ہے جو تم نے کیا، کیونکہ وہ شخص اپنے حدود سے تجاوز کرکے دوسرے کے حق میں دست اندازی کرنا چاہتا تھا، اور اس سے روکنا تمہارا اخلاقی فرض تھا۔ اس تصادم کیلئے کوئی تفصیلی قانون نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ انکو کسی ایک دائرہ میں لاکر حد بندی کرنا مشکل ہے، البتہ اسکو صحیح طریقوں پر لانیکا ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ افراد میں اتنی قوت فیصلہ پیدا کی جائے کہ وہ خود اسکے حدود متعین کر سکیں اور معلوم کر سکیں کہ کس جگہ انکا اخلاقی فرض انہیں کسی کے حق میں دخل دینے کی اجازت دیتا ہے اور کس جگہ نہیں ۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بعض علمائے اخلاقیات نے اسکی حد بندی کرنیکا قصد بھی کیا ہے اور کچھ حدود قائم کئے ہیں، مگر وہ اس میں سخت غلطیاں کر گئے ہیں۔ انکے قائم کردہ حدود پر اگر عمل کیا جائے تو بعض اوقات ایک آدمی ناجائز سے ناجائز افعال کو بھی جائز سمجھ کر کر سکتا ہے، اور کبھی وہ اپنے آپ کو ایسے قواعد سے جکڑا ہوا پاتا ہے کہ کوئی کام بغیر قانون کی رہنمائی کے نہیں کر سکتا۔ ایسی افراط و تفریط اخلاقیات میں کسی طرح جگہ نہیں پا سکتی

افراط وتفریط سے بچنے کا صحیح طریقہ ۔ اس افراط و تفریط سے بچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جماعت اس بنیادی قانون کی طرف رجوع کرے، جو جزئی احکام کی نسبت ایک قاعدہ کلیہ بنا دیتا ہے، اور جس کی رو سے اجمالاً تصادم کی حد بندی ہو جاتی ہے ۔ یہ بنیادی قانون نفس عاقلہ کا تحقق ہے جس کے ذریعہ افراد جماعت فرائض وحقوق کے تصادم سے بچ سکتے ہیں اور یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمکو کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اسی غرض سے ہم نے بار بار جماعت کے نفس عاقلہ کی تکمیل پر زور دیا ہے اور ان تمام باتوں کو جو افراد کے لئے صحیح اخلاقی ضابطہ بندی سے تعلق رکھتی ہیں نفس عاقلۂ اجتماعی کی تکمیل پر منحصر قرار دیا ہے ۔ جن قوموں کا اجتماعی نفس عاقلہ ترقی پا جاتا ہے وہ اخلاقی لغزشوں

اورگمراہی کے اندیشوں سے بچ جاتی ہیں،

اب یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ تکمیل نفس اجتماعی کی کیا صورت ہے؟ اس کا جواب صرف ایک لفظ سے دیا جاسکتا ہے، یعنی" تعلیم" جماعت کا ایک فرد بھی ایسا باقی نہ رہے جو صحیح تربیتی اصولوں پر تعلیم سے بے بہرہ ہو۔ اسکے بغیر جماعت کا نفس عاقلہ کسی طرح بھی مکمل نہیں ہوسکتا، اور جب وہ مکمل نہیں ہوسکتا تو افراط و تفریط سے بچنا بھی محال ہے۔ بس افراط و تفریط سے بچنا اور افراد کے لئے انکے حدود عمل کا متعین ہوجانا نفس عاقلہ کی تکمیل پر منحصر ہے، اور نفس عاقلہ کی تکمیل کے لئے صحیح تعلیم و تربیت لازم ۔

فرائض کی تقسیم۔ چند کلمات تقسیم فرائض کے متعلق بھی عرض کرنے ضروری ہیں۔ علمائے اخلاقیات نے فرائض و واجبات کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے، ایک قسم محدود و متعین فرائض کی ہے اور دوسری قسم غیر محدود اور غیر متعین فرائض کی۔ وہ امور جنکی تحدید ہوسکتی ہے فرائض اور وہ جنکی تحدید نہیں ہوسکتی نیکی یا فضائل کہلاتے ہیں۔ اسکی تشریح یہ کہ جو شخص اجباری فرائض کو ادا کرتا ہے وہ محض ادائے فرض کرتا ہے، اور جو اس سے آگے بڑھ کر کوئی احساسی فرض ادا کرتا ہے وہ نیکی اور فضیلت کا کام کرتا ہے۔ الکزنڈر نے "Moral Order and Progress" میں نیکی کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "ہر وہ کام جو فرض سے زیادہ ہے، نیکی ہے"

مل اس دوسری قسم کے فرائض کو فرائض کہنے کے بجائے "اخلاقی فضائل" سے تعبیر کرنا زیادہ بہتر سمجھتا ہے، اور فرائض کو عدالت کے ماتحت قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور کتاب "Utilitarianism" میں فرائض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"فرائض کے علاوہ چند اور اخلاقی فضائل بھی ہیں جو اگرچہ اخلاقاً فرض نہیں کئے گئے مگر ہم یہ چاہتے ہیں۔ کہ لوگ انکے خوگر ہوں، اور جب وہ اسکے خوگر ہوتے ہیں تو ہم انکی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایسے فضائل پر ہم کسی کو مجبور بھی نہیں کرسکتے"

ایک دوسری تقسیم۔ مشہور فلسفی کینٹ نے اسکے علاوہ ایک اور تقسیم بھی کی ہے۔ وہ فرائض کو دو قسموں پر منقسم کرتا ہے، ایک فرائض تامہ اور دوسرے فرائض ناقصہ۔ فرائض تامہ سے اسکی مراد وہ فرائض ہیں جن کا ہم سے قطعیت کے ساتھ مطالبہ کیا جاسکے، جیسے احترام ملکیت، احترام حیات اور احترام حریت وغیرہ۔ اور فرائض ناقصہ وہ ایسے فرائض کو کہتا ہے جو قطعیت کے ساتھ طلب نہ کئے جاسکیں مثلاً قومی خدمت۔ اول الذکر عموماً سلبی ہوتے ہیں اور آخر الذکر کلیتہً ایجابی۔ مگر اس نظریہ کے مطابق فرائض کو دو قسموں کے بجائے تین قسموں پر

تقسیم کرنا چاہیئے فرائض قطعیہ، فرائض اجتماعیہ اور فرائض انفرادیہ۔ آدم سمتھ نے اپنی کتاب "Theory of moral Sentiments" میں اس پر خوب بحث کی ہے۔ اس کے نزدیک فرائض قطعیہ وہ ہیں جو قوانین حکومت کی صورت میں نافذ کئے جا سکتے ہیں، فرائض اجتماعیہ وہ جنکی ہر متمدن جماعت سے توقع کیجاتی ہے، اور فرائض انفرادیہ وہ جو ہر اچھے شہری سے اخلاقاً طلب کئے جا سکتے ہیں۔

فرائض قطعیہ کا قانون۔ لیکن اس تقسیم کے مطابق جزئیات کی تفصیل و تعین کے ساتھ کوئی دوامی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ فرائض میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور جو فرائض حدود قانون میں آ سکتے ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً رعایا کے مدارج تمدنی اور حکومت کے نظام کے ساتھ گھٹتے بڑھتے اور ادلتے بدلتے رہتے ہیں ایک وقت میں ایک مقام کے خاص حالات کے مطابق کوئی قانون بنایا جا سکتا ہے، مگر وہ قانون تغیر حالات کا ہمیشہ تابع رہیگا۔ ہیگل اپنی کتاب فلسفۂ صواب میں کہتا ہے کہ:-

"کوئی ضابطۂ اخلاق مکمل نہیں ہو سکتا" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر ضابطۂ اخلاق اپنی مدت ختم کر کے بیکار ہو جاتا ہے اور اسکی جگہ ایک نیا ضابطہ تیار ہوتا ہے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر ضابطہ میں تغیر حالات کے لحاظ سے گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہود کے احکام عشرہ کوئی دائمی قانون نہیں ہیں، مگر اس سے ہمارا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ "قتل نہ کرو" کا حکم بھی عارضی ہے۔ ہر موٹی سے موٹی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ خزاں کے بعد جب درخت میں نئی ٹہنیاں نکلتی ہیں تو اصل درخت نہیں بدل جاتا، بلکہ پچھلی شاخوں اور پتوں کے بجائے دوسری شاخیں اور پتے آجاتے ہیں۔"

پس یہ ایک فیصلہ شدہ امر ہے کہ ہر زمانہ اور حالت کے مطابق فرائض قطعیہ کا جامع اور فرائض اجتماعیہ کا مختصر قانون بنانا ایک عمدہ نظام حکومت کا سب سے اہم فرض ہے۔

فرائض اجتماعیہ و انفرادیہ۔ ہم نے کہا کہ فرائض اجتماعیہ کا قانون مختصر بنانا چاہیئے، اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ اجتماعی فرائض کو کسی حالت میں بھی ایک جامع قانون کے ماتحت نہیں لایا جا سکتا، کیونکہ یہ نہ صرف اصولاً ناممکن ہے بلکہ حکومت کے دائرہ سے بھی خارج ہے۔ اجتماعی زندگی کے بیسیوں معاملات ایسے ہیں جن میں اگر حکومت دخل دے تو نظام درہم و برہم ہو جائے اور ایک سخت انتشار و ہیجان پیدا ہو جائے۔ اسی کے ساتھ ہم نے فرائض انفرادیہ کو تدوین قانون کے دائرہ سے الگ کر دیا ہے، اسکی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کا بھی کوئی قانون نہیں بن سکتا ان دونوں فرائض کے لئے جماعت اور افراد کو ان ہی کے عقل فہم اور جذبات و احساسات پر چھوڑ دینا

چاہیئے۔ اخلاقیات کا کام اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ انہیں اصول بتلادے۔ فروع کو ڈھونڈنا خود انسان کا کام ہے کیونکہ فطرت نے اس کو قوت تمیز و ادراک اسی لئے دی ہے کہ وہ اپنے لئے اچھی بُری راہ خود ڈھونڈے علم کا کام اس میں محض ایک روشنی پیدا کرنا اور اسکے قوائے عقلیہ میں ایک خاص صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اب یہ خود انسان کا فرض ہے کہ اس روشنی میں اپنے دائرۂ عمل کی تحدید، اپنے فرائض کی تعیین اور اپنے لئے راہ عمل کی تجویز کرے ؛

۴- محاسنِ اخلاق

پچھلی صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ اخلاقی فرائض سے متعلق تھا، اور اس میں ہم نے اختصار کے ساتھ یہ بتلانے کی کوشش کی تھی کہ انسانی فرائض کیا کیا ہیں اور ان میں باہم کیا تعلق ہے؟ اب ہمیں واجبات کے دائرہ سے نکل کر عادات و خصائل کے دائرہ میں آنا چاہیئے، اور تحقیق کرنا چاہیئے کہ اخلاق ہم میں کن خصلتوں کو دیکھنا چاہتا ہے اور اسکے نزدیک ایک بہترین انسان کی صفات خلقیہ کیا ہونی چاہئیں۔ ایسی اعلیٰ صفات کو اخلاقیات کی اصطلاح میں محاسن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ محاسن دراصل فضائل اخلاق کا سرچشمہ ہیں، کیونکہ جب نفس ارادی اعمال کا محرک اصلی ہے تو ضرور ہے کہ اسی کی اچھائی اور برائی پر اعمال کی اچھائی اور برائی موقوف ہو۔ اگر نفس محاسن اخلاق سے متصف ہوگا تو اعمال بھی ضرور نیک ہونگے۔ اور اگر خود وہی رذائل سے آلودہ ہوگا تو کوئی وجہ نہیں کہ عمل جو اس کے تابع ہے بہتر ہو۔ پس ایک اخلاقی اسٹوڈنٹ کا یہ ایک دلچسپ کام ہے کہ وہ اس سرچشمہ کی تلاش کرے،

حسن اخلاق کیا ہے؟ ارسطو نے کہا ہے کہ "محاسن دانستہ اختیار افعال کے ملکۂ نفسانی کی پیداوار ہیں" یعنی صاحب اخلاق حسنہ وہ شخص ہے جس نے اپنی سیرت میں راہ صائب کے اختیار کا ملکہ پیدا کیا ہو۔ اور چونکہ راہ صائب افراط و تفریط کے وسط میں ہوتی ہے اس لئے وہ یہ نتیجہ مستنبط کرتا ہے کہ حسن خلق دراصل اختیار توسط کا نام ہے۔ مگر صرف یہ کہدینا کافی نہیں کہ حسن خلق اختیار توسط کا نام ہے بلکہ اس پر یہ مزید قید لگانی چاہیئے کہ وہ وسط، وسط اعتباری ہے، ہر شخص کے ذاتی حالات اور اسکے اخلاقی ماحول کے اعتبار سے اس کا اندازہ لگایا جاتا ہے، قطعیت کے ساتھ اس کی تحدید نہیں کیجا سکتی۔ مثلاً سخاوت ایک حسن اخلاقی ہے، جو اسراف و تبذیر اور بخل کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اسکے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کو اتنا خرچ کرنا چاہیئے، اتنا اپنے پاس رکھنا چاہیئے، اتنا خرچ کرنے والا مسرف ہے اور اتنا نہ کرنے والا بخیل۔ کیونکہ ہر شخص کے حالات جدا ہیں اور بخل و اسراف کا حکم انہی

حالات کے مطابق لگایا جاسکتا ہے۔ ایک شخص جس کی پونجی صرف پانچ روپے کی ہے اگر وہ اپنے ان روپوں کو جُگا جُگا کر خرچ کرتا ہے تو کوئی شخص اسے بخیل نہیں کہہ سکتا، لیکن اگر ایک دوسرا شخص جو ہزار روپیہ کی استطاعت رکھتا ہے پانچ روپے والے آدمی کی طرح اس کی نظر پیسہ پیسہ پر رہتی ہے تو ہم اسے کنجوس اور بخیل کہتے ہیں پس معلوم ہُوا کہ یہ اوسط حالات کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے نہ کہ قطعیت کے ساتھ۔

تغیر حالات کا اثر۔ اس کے علاوہ ایک اور شئے بھی ہے جو محاسن کی اصلیت میں اثر رکھتی ہے۔ افراد کے ذاتی حالات ایک بڑی حد تک قوم کے اجتماعی حالات سے علاقہ رکھتے ہیں اور اجتماعی رسوم، عادات، شعائر، اور تمدن و معاشرت کو ان کی تخلیق میں بڑا دخل ہے۔ پس جس طرح ہر جماعت کے یہ اجتماعی حالات جدا ہوتے ہیں، اور جس طرح ہر زمانہ میں وہ بدلتے رہتے ہیں، اسی طرح افراد کے ذاتی حالات میں بھی بہت کچھ تغیر ہو جاتا ہے اور محاسن اخلاق کے اطلاق پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک جنگی قوم کے ہاں شجاعت جن صورتوں میں ظہور کرتی ہے وہ ایک تجارتی قوم کی شجاعت سے مختلف ہوتی ہیں، اور آج سے چند صدی پہلے جن افعال کو ہمارے ہاں شجاعت سے تعبیر کیا جاتا تھا، وہ آج کے شجاعانہ افعال سے مختلف ہیں۔ اس پر قومی رسوم و شعائر کے اثر کو بھی قیاس کر لو۔

اسی بنا پر ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ محاسن اپنی قومی رسوم و عادات کی عاقلانہ پابندی اور اپنی قومی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہیگل کہتا ہے کہ:۔

"قدیم زمانہ سے بڑے بڑے حکما کا یہ فیصلہ ہے کہ نیکی اور فضل نام ہے اپنی قومی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنیکا"

بریڈلے تو یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ "جو شخص اپنے ماحول سے بلند تر اخلاق کی طرف جانا چاہتا ہے وہ بداخلاقی کی سرحد پر ہے" مگر یہ بہت مبالغہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتماعی حالات اور قومی روایات محاسن اخلاق کے اطلاق پر اثر رکھتے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ محاسن اخلاق کا معیار ہی قومی روایات و رسوم ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو کوئی قوم اخلاقی ترقی نہیں کر سکتی۔ اسکے تمام افراد پر ایک اخلاقی جمود طاری ہو جائیگا، اور وہ اپنے رسوم و شعائر کے اعتبار سے جس سطح پر ہوگی اسی پر قائم رہیگی۔ بریڈلے نے اگر اس حقیقت پر غور کیا ہوتا، کہ دُنیا کی اخلاقی ترقی ایسے ہی لوگوں کی رہین منت ہے جو اپنے گرد و پیش کی سطح سے بلند تر سطح پر جانیکی کوشش کرتے ہیں، تو شاید وہ اس کو

بد اخلاقی سے تعبیر نہ کرتا۔

غلط فہمی کی وجہ۔ درحقیقت یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ لوگوں نے محاسن اخلاق کے اطلاق پر تغیر حالات کے اثر کو اچھی طرح نہیں سمجھا اور وہ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ تغیر حالات کے ساتھ محاسن کی فطرت بھی بدل جاتی ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ سخاوت جس حسن اخلاق کا نام ہے وہ جس صورت میں بھی ظاہر ہو اسے بہرحال سخاوت ہی کہینگے۔ ایک شخص اگر دس روپے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے کسی حاجتمند کی حاجت رفع کرتا ہے تو اس کی سخاوت اپنی اصلیت میں اس شخص کی سخاوت سے کچھ بھی مختلف نہیں جو اپنی حیثیت کے مطابق ۱۰ ہزار روپیہ کسی یتیم خانہ کو دیتا ہے۔ اسی طرح جو شجاعت کسی جنگجو سے میدان جنگ میں ظاہر ہوتی ہے وہی شجاعت ایک سائنٹیفک محقق سے میدان تحقیق میں مصائب کا مقابلہ کرنے سے ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک برقی قوت کہیں پنکھے چلاتی ہے، کہیں روشنی کرتی ہے، کہیں پریس مشین کو حرکت دیتی ہے اور کہیں آٹا پیستی ہے۔ کام مختلف ہیں۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ وہی ایک قوت ہے جو برقی لیمپ میں جاکر روشنی بن جاتی ہے، پنکھے میں جاکر گھومنے لگتی ہے اور موٹر میں جاکر مشین چلانے لگتی ہے۔ پس محاسن میں اطلاقی حیثیت سے خواہ کتنا ہی اختلاف ہو مگر وہ ملکۂ نفسی جو حسن اخلاق کی اصل ہے، اپنی فطرت میں ایک ہی ہوتا ہے

علامہ چانکیہ کے اقوال

تمام جنگل ایک خوشبودار درخت سے معطر ہو جاتا ہے۔ یہی حالت اُس شریف مطیع۔ فرمانبردار مقدس لڑکے کی ہوتی ہے جسکی وجہ سے اُسکے خاندان کی عزت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔!!!

جس طرح تمام جنگل ایک چنگاری سے جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ اُسی طریقہ سے ایک بد اطوار لڑکے سے اس کا خاندان تباہ ہو جاتا ہے!!!

وہ احباب جو تمہارے سامنے خوشامد اور تمہاری غیبت میں بدی کریں اُن سے احتراز کرو اُنکا وجود مثل اُس سنہرے پیالہ کے ہے جس میں زہر مگر لبالب دودھ بھرا ہو!!!

(محمد مشیر احمد علوی)

کلامِ حسرت

عاشقوں سے نارواہے بیوفائی آپ کی
حد سے بڑھ جائے نہ شانِ کج ادائی آپ کی

آرزوئے دل پہ آئینگی نہ کیا کیا آفتیں
در پئے انکار ہے نا آشنائی آپ کی

خوب رُو ہیں آپ مانا ہم نے پھر بھی اس قدر
دیکھئے اچھی نہیں ہے خودستائی آپ کی

رہ گئی اہلِ ہوس میں، یادگارِ حُسن و عشق
ناز برداری ہماری دلربائی آپ کی

مجھ سے یہ اکثر کہا کرتا ہے وہ مخمورِ ناز
دیکھئے نبھتی ہے کب تک پارسائی آپ کی

اک ہمیں تو کچھ نہیں ہیں آپ کے طاعت گذار
تابعِ فرماں ہوئی ساری خدائی آپ کی

کیسے دیکھے، کون دیکھے آپ کا نورِ جمال
جان جب ٹھیری ہوئی ہو رُونمائی آپ کی

آپکو آتا رہا میرے ستانے کا خیال
صُلح سے اچھی رہی مجھ کو لڑائی آپ کی

برقؔ[1] کا اکثر یہ کہنا یاد آتا ہے مجھے
"تنکے چنوانے لگی ہم سے جُدائی آپکی"

عرض کر کے حالِ دل کس درجہ ہیں محجوب ہم
دیکھ کر غصے میں صورت تمتمائی آپ کی

شاہِ جیلاں کے سوا مشکلکشا کے واسطے
کون کرتا اور حسرتؔ رہنمائی آپ کی

حسرت موہانی

آستیں

دید کے قابل ہے رنگِ لالہ زارِ آستیں
اشکِ خونیں بن گئے نقش و نگارِ آستیں

کیوں نہ کر دے ٹکڑے ٹکڑے تار تار آستیں
کیوں مرا دستِ جنوں ہو زیر بار آستیں

رہ گئے ہیں پنجۂ وحشت میں کچھ اُلجھے ہوئے
چند تار آستیں ہیں یادگارِ آستیں

ہو گیا تقسیم آخر خارزار عشق میں
تار تار جیب و دامن، تار تارِ آستیں

اپنے دو ہاتھوں کو میں جوشِ جنوں میں کیا کہوں
ایک خارِ آستیں ہے، ایک مارِ آستیں

جوشِ وحشت میں یہ اچھا شغل سوجھا ہے ہمیں
ٹکڑے کر کے گنتے ہیں ایک ایک تارِ آستیں

اب کہاں پہلو میں اے ندرت وفا پروردہ دل
ہو گیا اشکوں میں گھل گھل کر نثارِ آستیں

ندرت ایڈیٹر اخبار آئینہ میرٹھ

[1] برق یعنی مرحوم عظمت اللہ برقؔ کانپوری

سرزمین عشق

آ۔ اس ملک کو چھوڑ دیں کہ یہاں انسانیت کا کال ہماری روحوں کو مردہ کر رہا ہے ——! اس ملک میں ہم کبھی روحانی آرام کا منہ نہیں دیکھ سکتے، اس خاک میں ہمارے لئے خوشی کا پھول نہیں کھل سکتا ——!

آ۔ یہاں سے چلے جائیں، ایک آزاد اور پاک دنیا تلاش کریں ——! اس ملک کو چھوڑ دیں اور ہمیشہ کے لئے بھول جائیں کہ یہاں ہمارے دل نوگرفتاران قفس کی طرح بیقرار ہیں ——!

آ۔ اس ملک سے باہر چلے آئیں کہ یہاں ہماری روح کے نغمے کوئی انعکاس نہیں پیدا کرتے —! ایک ایسے ملک کی طرف کوچ کریں، جہاں ہمارے غمگین دلوں، اور اندوہگین روحوں کو سکون ملے ——!

اس سفر میں، بیسیوں کٹھن راستے اور بے خواب راتیں آگے آئینگی، لیکن اُنہیں تیرے دل کی صفائی، اور میری روح کی بردباری عبور کریگی —— ——!

اس سفر میں ہمیں سینکڑوں دکھ درد، مُصیبتیں اور تکلیفیں اپنے حملوں کا نشانہ بنائینگی۔ لیکن تیرے دل کی خوشی اور میری رُوح کی متانت انہیں مغلوب کریگی ——!

اس سفر میں ہم مجبور ہونگے کہ بہت سے خوفناک جنگلوں، بیابانوں، اور ہیبتناک دروں اور گھاٹیوں سے گذریں لیکن تیرے دل کی لطافت اور میری رُوح کی قوت دونوں مل کر ان سختیوں اور مُصیبتوں سے ہمیں اپنی پناہ میں رکھیگی ——!

آ۔ اس مٹنے والی دُنیا کو ابھی سے الوداع کہدیں، اور وہاں اُس پاک دُنیا میں چل کر ایک خوشیوں بھری اچھوتی زندگی کا آشیانہ بنالیں!!!

اُٹھ! ہمت کر!! تاکہ اس مُلک کو چھوڑ دیں اور اُس نئی سرزمین یعنے سرزمین عشق میں چل کر بس جائیں!!! —— !!!

(ترجمہ از جرمنی)

صاحبزادہ حامد سعید خاں حامد ٹونکی

یادِ ایّام

امام محمدؒ، امام شافعیؒ کے استاد تھے۔ ایک مجمع میں امام محمدؒ نے اہل مدینہ کی ہجو کی، امام شافعیؒ کو مدینہ اور اہل مدینہ سے بہت محبت تھی، وہ یہ سُن کر چیں بہ جبیں ہو گئے۔ امام محمدؒ نے کہا میں نے اہل مدینہ کی ہجو میں ایک کتاب بھی لکھی ہے، اس کا ایک لفظ بھی کوئی غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ امام شافعیؒ غصہ سے بیتاب ہو گئے بولے، واللہ تمہاری ساری کتاب غلط ہے، صحت تو صرف خدا کے کلام کے لئے ہے۔ یہ تم نے کیا دعوے کیا، امام محمدؒ یہ سُن کر چُپ ہو گئے۔ (مناقب الشافعی للرازی صفحہ ۳۲ مطبوعہ مصر)

کیا اب بھی ہمارے مدرسے استادوں کی ایسی رواداری، اور شاگردوں کی ایسی بے باکی کی نظیر پیش کر سکتے ہیں؟ ناظر

ایک دفعہ حضرت حسن بصریؒ بازار میں کپڑا خریدنے تشریف لے گئے، بزاز نے کہا "صرف آپ ہی کو اس قیمت پر دیتا ہوں"، چونکہ اس رعایت کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ بہت بڑے محدث تھے، اور یہ اس کا معاوضہ تھا، فوراً دوکان سے اُٹھ گئے، اور پھر تمام عمر خرید و فروخت کیلئے بازار نہ گئے (مسند دارمی صفحہ ۷۵)

علماء کی یہ احتیاط اب خواب و خیال ہے! ناظر

ایک عالم رات کے وقت کہیں جا رہے تھے، اتفاق سے راستہ بھول کر کنوئیں میں گر پڑے۔ صبح کو لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز سُن کر استعانت چاہی، وہاں ان کا شاگرد کھڑا تھا اُستاد کی آواز سُن کر نکالنے کی رسی ڈالی، انھوں نے کہا پہلے نام و نشان بتاؤ، اس نے اپنا نام بتلایا، بولے تم میرے شاگرد ہو، تم سے استعانت نہیں چاہتا، یہ مدد تعلیم کا معاوضہ ہو جائیگی۔ (تحفۃ الاحرار)

اب میں اور پہلے میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ ناظر

حضرت امام حسن بصریؒ اور واصل بن عطا کے درمیان کسی مسئلہ پر اختلاف ہو گیا، واصل نے

اپنا حلقۂ درس علیحدہ کرلیا کہ مبادا اختلاف کی بنا پر تصادم نہ ہو جائے، اور مسائل سے گذر کر دلوں میں اختلاف نہ پڑ جائے، (تذکرہ الفاظ)

کیا ان باتوں میں ہمارے مقدس علماء کے لئے کوئی بصیرت ہے؟ ناظر

نظیری نیشاپوری، خان خاناں کا درباری شاعر تھا، ایک دفعہ اس نے کہا آج تک میں نے اپنی آنکھ سے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا۔ خان خاناں نے خزانچی کو حکم دیا، اسی وقت لاکھ روپے کا ڈھیر لگ گیا نظیری نے شکریہ ادا کیا کہ آپ کی بدولت یہ تو آرزو پوری ہوگئی، خان خاناں کی اداشناس نظریں اصل بات تاڑ گئی تھیں، وہ روپے نظیری کے گھر بھیجوا دئے۔ (مآثر رحیمی)

کیا امراء میں ایسی علم پروری اب بھی باقی ہے! ناظر

نظم

دائرہ تیرے تجسس کا اگر محدود ہے ۔۔۔ شرکت بزم طلب اے دل تری بے سود ہے

اجتماعِ نور و ظلمت ایک جا ممکن نہیں ۔۔۔ عشقِ دل افروز کے آگے خرد مفقود ہے

ہے ہجومِ آہ یوں میرے دل پرداغ میں ۔۔۔ اس کے ہر ذرے میں گویا ایک موجِ دود ہے

وہ اگر دینا نہ چاہیں کچھ تو یہ ہے اور بات ۔۔۔ ورنہ بالا از قیاس ان کی عطاؤ جود ہے

نامکمل تھی بجز جس کے یہ نظمِ کائنات ۔۔۔ حسن وہ سر مطلعِ دیوانِ ہست و بود ہے

دید کا وعدہ اٹھا رکھا ہے روزِ حشر پر ۔۔۔ اِمتحانِ صبر یوں میرا انہیں مقصود ہے

سطوتِ شاہی کی ہے یہ قدر چشمِ عشق میں ۔۔۔ اک نگاہِ ناز کی قیمت دلِ محمود ہے

نکتہ بتلایا یہ عصیاں کی ندامت نے مجھے ۔۔۔ خندۂ جنت نثارِ چشمِ اشک آلود ہے

دل کے جل جانے کا اے شاکر مجھے کچھ غم نہیں
یہ زیاں وہ ہے کہ جس کی جیب پر از سود ہے

شاکر صدیقی (گوجرانوالہ)

فلسفۂ فطرت

دنیا میں جہاں تک انسانوں کی پہنچ ہے اُن حصّوں کا ایک سطحی علم ہمیں بتاتا ہے کہ سب کی تقسیم ہوا سمندر اور ٹھوس زمین میں کیجا سکتی ہے۔ علم حکمت کے شیرخوارگی کے زمانہ میں پرانے لوگ سمجھتے تھے کہ عناصر صرف چار ہیں۔ آگ - ہوا۔ مٹی اور پانی مگر زمانہ حال کی بے مثال ترقیاں پکارے گلے چلا رہی ہیں ؎

ہو چکا ہے آج تک تریسٹھ عناصر کا ظہور

آپ آب و باد و خاک و نار رہنے دیجئے (عزیز)

فلسفہ فطرت کی کامیاب تلاش ہر پہلو، ہر واقعہ سے شروع کیجا سکتی ہے اور اسی سلسلہ میں وہ تمام نئی باتیں بتائی جا سکتی ہیں جو اس صیغۂ معلومات میں۔ انسانی دماغ کی سرگرم کوششوں کا نتیجہ ہیں مگر جب ہم خوشیوں بھری فرصت میں اپنا نقطۂ آغاز منتخب کرتے ہیں تو سب سے اچھا یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی بہترین۔ حقیقی۔ فطری اور خلقی سلسلہ کے دوش بدوش چلے چلیں۔

وہ تمام ترقیاں جو ہمارے وقت میں فلسفی حضرات نے کی ہیں۔ سب کی سب محض علم حکمت کے زبردست بنیادی اصول کے صاف ستھرے حس و ادراک کا ماحصل ہیں۔ ورنہ تمام چیزوں کی ایسی عام فہم تفصیل۔ تو صرف دلائل عقلی و نقلی سے ممکن ہے نہ انسان کی محدود ذہانت کے بس میں ہے۔ بلکہ صرف سچے سچے فطری واقعات کی دیکھ بھال ان کی پوری تشریح کر سکتی ہے۔ یہی واقعات شروع شروع میں ہمارے لئے مضامین کی سُرخی ابواب کے عنوان کا کام دیتے ہیں اور علم حکمت کے دور دراز ممالک میں۔ صرف ان واقعات کا حوالہ دیدینا کافی ہوتا ہے۔ یعنی کبھی تو ان کی مشابہت اور کبھی انکے اختلاف کا حوالہ ایسی پیچیدہ باتوں پر کافی روشنی ڈالدیتا ہے جو بغیر اس ترکیب کے نامکمل۔ بے ترتیب اور سمجھ سے باہر رہ جاتیں۔

نقاش فطرت نے تمام مادی موجودات کو ہمارے لئے تین مذکورالصدر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جن میں اکثر مخصوص خط و خال بھی موجود ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ "اصل مادہ" ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اسکے کافی سے زیادہ نمایاں ثبوت۔ زمین والے مٹیالے غلاف کے وہ رنگین دھبے ہیں۔ جنہیں ہم۔ پہاڑ۔ وادی۔ ساحل کے نام سے پکارتے ہیں اور

جن کی اصلی حالت وصورت میں صدیوں تک ذرا بھی تبدیلی نہیں آتی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ "باد بسیط" ہی اکیلی وہ چیز ہے جو خود بھی جلد جلد بدلتی رہتی ہے اور بظاہر باد اُن تمام تبدیلیوں کا سبب ہوتی رہتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہی چیز دو مرتبہ ایک ہی شکل میں ہمارے سامنے آجائے کیونکہ باد بسیط کی سیماب مزاج ہوائیں ہر وقت کچھ سے کچھ ہوتی رہتی ہیں اور اس میں ہمیشہ ہر ممکن رنگ روپ کے بادل تیرتے رہتے ہیں۔

حقیقتاً یہی باد بسیط تمام ارض نقل وحرکت کی اصل درجہ ہے۔ سمندر والے طوفان صرف ہوا والے طوفان سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ دریا کی رفتار بھی انہیں تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو فضائی ہواؤں میں ہوتی رہتی ہیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے تو صاف نظر آئیگا کہ انہیں تبدیلیوں سے اتنے زیادہ فائدے مترتب ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا احاطہ وشمار لفظوں میں۔ عددوں میں ممکن ہی نہیں ہے۔

یہی سہانی فضا، ان تمام ان گنت رنگ وروپ والے مخلوق کی جائے پیدائش ہے۔ جو دنیا، حیوانات و نباتات میں موجود ہیں۔ انہیں فضائی ہواؤں سے ایسے سامان مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے شاداب پودے اپنے مختلف ڈھانچے اختیار کر لیتے ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جنکی وجہ سے ہر قسم کے حیوان پردہ ہی پردہ میں اپنی غذائیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہوائیں روزی رساں ہیں۔ زندگی کی اس حیات کا سہارا ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر حیوان کے وجود میں ہر گھڑی لگاتار تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو آخر میں موت کا ظالم ہاتھ بن کر انکے جسموں کو کچھ سے کچھ کر دیا کرتی ہیں۔ یہی ہوائیں اُن کے سڑے گلے ہوئے اجسام سے "اصل مادہ" جوہر اصلیہ کھینچ لیتی ہیں اور انہیں داشتہ آید بکار سمجھ کر محفوظ رکھتی ہیں۔

ہمارے زمانہ کی بہترین جانچ پرتال یہ ہے کہ یہی جوہر (جو سڑے ہوئے جسموں سے مل جاتے ہیں) انہیں کا استعمال ہرے بھرے پودوں کو نشو ونما دیتا ہے اور انکے بقاؤ قیام کا سبب بنیا رہتا ہے اب یہ بات طے سمجھئے کہ اصل یا جوہر کبھی برباد نہیں ہوتا۔

دنیا ایک چرخی ہے اور جوہر اس چرخی میں اس انداز سے چکر لگایا کرتے ہیں کہ کبھی دھانی پودوں میں رنگ و بو ہو کر رہتے ہیں کبھی چالاک حیوان میں ہوش وتمیز بن کر بسر کرتے ہیں۔ غرض یہ جوہر فضائی ہواؤں سے آتے ہیں اور پھر انہیں میں واپس ہو جاتے ہیں۔

صرف یہی باتیں نہیں ہیں، کہ ان ہواؤں کا سہانا رنگ آسمانی ہے۔ جسے کم نگاہ حضرات آسمان کہتے ہیں یا ان میں رات بھر نورانی نقطے جگمگاتے رہتے ہیں۔ یا ان پر چلتی پھرتی ہُوئی بدلیاں چھائی رہتی ہیں جو فضائی نظارہ کو اتنا نظر فریب بنا دیتی ہیں کہ ان کا ہر رنگ آنکھوں میں کھپ جاتا ہے۔ ہر انداز دل میں اتر آتا ہے۔ یا ان میں ایسے زبردست نسبتی رشتہ موجود ہیں۔ جنکا تعلق موت وحیات کے واقعات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جو فہیم وعقیل طالب علم کی توجہ کو مبذول کر لیں بلکہ ان کا اثر ہمارے روزمرہ کے واقعات پر اتنا زیادہ پڑتا ہے کہ ہمکو خواہ مخواہ ان کا بیان ذرا اور تفصیل کے ساتھ کرنا ضروری ہے۔

علم الحیات جاننے والوں نے پتہ لگا لیا ہے کہ فضائی ہوائیں ہماری زمین کو ہر طرف سے پچاس میل کی دبازت سے گھیرے ہُوئے ہیں۔ مگر زمین کے زبردست تودہ کے مقابلہ میں انکی جسامت ایسی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے کہ ہر پہلو سے زمین کا بیچوں بیچ والا حصہ قریب قریب . . . ۴ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان ہواؤں کی گہرائی اس زبردست فاصلہ کے اعتبار سے صرف اٹھارھویں حصہ کے برابر ہے۔

اگر ہم ۱۸ انچہ کے گولے پر فضائی ہواؤں کی جسامت دکھانا چاہیں تو ان کی دبازت ایک بٹا دس $\frac{1}{10}$ انچہ سے بھی کم رہ جائیگی۔

دیکھ بھال سے پتہ چلتا ہے کہ فضائی ہوائیں کم تعداد میں قطعی بے رنگ۔ بالکل اجلی نرمل صاف شفاف ہوتی ہیں اور پانی یا ٹھوس چیز کے مقابلہ میں بہت ہلکی پڑتی ہیں کیمیا والوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ہوا کوئی خاص عنصر نہیں ہے (جیسا پورانے زمانہ والے حضرات خیال کرتے تھے) بلکہ اس میں بہت سے اور مادے بھی شامل ہیں۔ اس وقت ہمارے لئے صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ اس میں دو خاص الخاص جوہر موجود ہیں۔

آکسیجن = ہوا کا وہ خاص جزو جو روشنی و زندگی کے لئے ضروری ہے۔

نطروجن۔ سوز و والا مخصوص جزو۔

ان کے علاوہ دوسرے نسبتی اجزا بھی کم کم تعداد میں شامل ہیں۔

(الف)۔ وہ جزو جس کی مدد سے دہکتے ہُوئے کوئلوں سے تیزابی نمک نکالا جاتا ہے۔

(ب) پانی سے حاصل کی ہُوئی بھاپ۔ فلسفہ فطرت والوں کے نزدیک باد بسیط ہر قسم کی

ہواؤں کا گلدستہ (مجموعہ) ہے اور اس میں ان سب کے خاص خاص اجزاء تمام وکمال انداز سے مخلوط و محفوظ رہتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر انفرادی ہوا میں کوئی نہ کوئی نمایاں خصوصیت امانت کی ہوئی ہے مثلاً کوئی پیلی ہوتی ہے کوئی آسمانی۔ کسی کا رنگ بیر بہوٹی کی طرح لال ہوتا ہے کوئی ہلکے سُرخ رنگ کی ہوتی ہے۔

ہمارے نزدیک باد بسیط کی سب سے پہلی خصوصیت یہی ہے کہ اس کی جسامت معینہ حد سے کم کی جا سکتی ہے۔ اس میں بلا کی لچک ہے۔ غضب کا لنگر ہے۔ ان دونوں صفتوں کی سہل سی مثال ملاحظہ فرمائیے۔

اگر ہم شیشہ کی ایک لمبی نلکی لے لیں جس کے اوپری سرے پر ایک گول گیند بنا ہُوا ہو اس کو پانی سے لبا لب بھر لیں پھر اس کے نچلے سرے کو پانی بھرے برتن میں ڈبو دیں۔ اب اگر ہم اس گول گیند پر اولہ کی تہئیں جمائیں۔ جوہر شراب ڈالیں یا کسی اور تدبیر سے اسمیں سردی پہنچا دیں تو صاف پتہ چل جائیگا کہ اندر والی ہوائیں دب دب کر پہلے سے کم فاصلہ میں گھر گئی ہیں اور اگر ہم اسی گیند کو ہتھیلی سے مل کر گرمی پہنچا دیں تو وہی دبی دبائی ہُوئی ہوائیں لچک لچک کر اپنی اصلی حالت پر آجائینگی۔
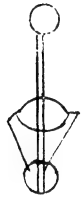
یہی پھیلنے اور دب جانے والی خاصیتیں ہیں جو باد بسیط کو ٹھوس اور سیال جزوں سے الگ تھلگ کر دیتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دوسری اور تیسری میں بھی یہی صفتیں موجود ہیں۔ مگر تھوڑی تھوڑی سی ہیں۔

ہم نے مان لیا ہے کہ تمام چیزیں فطری طور سے اس طرح خلق ہُوئی ہیں کہ انکے اجزاء آپس میں مربوط مخلوط نہیں ہیں بلکہ کھینچنے اور جُدا کرنے والی قوتوں کی مدد سے اپنی جگہ قائم رہاتی ہیں اسی اصول کی بناء پر لازم و ملزوم ٹھیرتا ہے کہ باد بسیط میں جدا کرنے والی قوت۔ کھینچنے والی مرجھائی ہُوئی ہے حالانکہ ٹھوس چیزوں میں اس کا اُلٹا ہے اور سیال چیزوں میں دونوں قوتیں ایسی برابر برابر ملی جُلی ہُوئی ہیں کہ اِن کے وزن و اختیار۔ جسامت و مقدار میں بال بھر بھی فرق نہیں ہے۔

جہانتک نسبتی وزن کا تعلق ہے۔ فضائی ہوائیں۔ دوسری مادّی اشیاء سے کہیں زیادہ بلند مرتبت رفیع الدرجات ہیں۔ کیونکہ ان میں فطرت کا وہ بہترین جوہر موجود ہے جسے ہم ہائیڈروجن روح ہوائے لطیف

جو پانی کا ایک جز ہے) کہتے ہیں۔

اسکے علاوہ جہانتک ہمیں معلوم ہے صرف یہی باد بسیط تمامی موجودات میں سب سے زیادہ لچکیلی چیز ہے مثلاً فضائی ہوائیں چاہے کسی مقدار میں ہوں۔ کیسے ہی محفوظ دھات کے برتن میں رکھ دی گئی ہوں۔ جب باہر نکلینگی تو انکی اصلی حالت و سابقہ شکل میں ذرا بھی کمی و تبدیلی نہ ہوگی۔

یہی لچک باد بسیط کی پھیل جانے والی صفت کو بھی مدد پہنچاتی رہتی ہے۔ فرض کیجئے کہ فضائی ہوائیں کسی بے پایاں خلاء میں قید کردی جائیں یا کسی ایسی حالت میں نظر بند کیجائیں جہاں کسی قسم کی کوئی خارجی قوت دست انداز نہ ہوسکے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کا پھیلاؤ بھی بے پایاں ہوگا۔ اجزاء اصلیہ کی جدا کرنیوالی قوت۔ کھینچنے والی پر چھاجائیگی اور ستم یہ کہ وہاں کوئی ہمدرد ایسا نہ پہنچ سکیگا جو انکے برہمی انتشار کو روک سکے مگر جب باد بسیط کسی ٹھوس چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے تو اس کی صورت جداگانہ ہوا کرتی ہے۔ پھیلاؤ ضرور ہوتا ہے مگر اپنی حدود میں سے بڑھنے نہیں پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ زمین اور سیارے لچکیلی فضائی ہواؤں میں ہمیشہ گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح ہماری زمین کا گولا ہر معلق چیز کو (چاہے وہ بم گولے ہوں یا توپ گولے ہوں) اپنی طرف گرا لیتا ہے اسی طرح کھینچنے والی قوت ہوا کے پھیلاؤ کو محدود کرلیتی ہے اور فضاء کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھتی ہے۔ باد بسیط منتشر نہیں ہونے پاتی بلکہ ہر پہلو سے نظر بندیوں میں جکڑی ہوئی رہتی ہے۔ اسکے علاوہ جو قوتیں ہماری زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہیں وہ بھی فضائی ہواؤں کو منتقل کرسکتی ہیں۔ کیونکہ سردی سے انکے اجزاء میں اینٹھن و سمٹن پیدا ہوجاتی ہے۔ مشاہدات نے بتایا ہے کہ ہم فضاء فلکی میں جتنے بلند ہوتے جائیں سردی اسی قدر بڑھتی جاتی ہے اور ہر قسم کی ہوائیں برودت کی وجہ سے زیادہ گاڑھی اور کثیف ملتی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمین کی کشش اور بالائی سردی یہی دو زنجیریں ایسی ہیں جو باد بسیط کو اپنی حدود انتہائے زیادہ نہیں پھیلنے دیتیں۔ اور اسی وجہ سے تودۂ زمین کے کسی پہلو پر فضائی ہواؤں کی دبازت پچاس میل سے زاید نہیں ہے مگر ہاں مختلف بلندیوں پر فضائی ہواؤں کی کثافت جداجدا ہے۔ انکے وہ حصے جو زمین سے زیادہ قریب ہیں ان بے چاروں کو اپنے اوپر والے بوجھ کا پورا پورا لنگر اُٹھانا پڑتا ہے۔ مگر یہی لنگر ہلکا اور زیادہ ہلکا ہوتا جاتا ہے۔ جیسے جیسے فضائی ملکوں میں اونچے اور زیادہ اونچے ہوتے جاتے ہیں چونکہ اُن بلند مقامات میں دباؤ ڈالنے والی ہوائیں کم مقدار میں ہوتی ہیں لہذا لازمی طور پر انکا لنگر بھی ہلکا ہونا چاہیئے۔

وہ نچلے حصے جو سطح زمین پر گڑے ہوئے ہیں۔ انکی کثافت سب سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے مگر ہم جتنے اونچے ہوتے جائیں۔ ان کا گاڑھا پن بھی اُتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے، یوں سمجھئے کہ اگر ہم چار اوڑھے پوستین تلے اوپر جما کر رکھدیں تو سب سے نچلی پوستین اپنے اوپر والی تینوں پوستینوں کے بوجھ لنگر یا دباؤ سے دب جائیگی اور سب سے اوپر والی پوستین پر ذرا بھی اثر نہ ہوگا۔

بالکل یہی حالت ان اجزار کی بھی ہے جن سے فضائی ہواؤں کی خلقت ہوئی ہے اسی لئے سطح زمین پر باد بسیط بہت گاڑھی ہے اور پہاڑ کی چوٹیوں پر بہت کم کثیف ہے اگر ہم ذرا بھی عقل سلیم سے کام لیں تو یہ بات سورج سے زیادہ روشن ہو جائیگی کہ فضائی ہواؤں کے لنگر اور لچک میں ایک عجیب رشتہ سربستہ موجود ہے، ذرا سوچئے تو اگر ہمارے اردگرد والی ہواؤں میں لچک کم ہوتی تو اوپر والے اجسام کا لنگر۔ اجرام فلکی کا دباؤ۔ اسکو منتشر و برباد کر دیتا اور اگر زیادہ ہوتی تو کسی قسم کا کوئی دباؤ نہ پڑتا اور ہوائے لطیف پھیل کر خدا جانے کیا سے کیا ہو جاتی ؁

لازمی نتیجہ ۔ جرعی ماحصل یہی ہوا کہ کسی ہوا کی لچک نہ تو کم ہے نہ زیادہ بلکہ بعینہ و بجنسہ اسی لنگر کے برابر ہے جو اس کے اوپر چھایا ہوا ہے ؁

طالب الہ آبادی

قطعہ

مرے مینائے دل میں اے طرب جو! بھرا ہے تلخ سا بادہ ازل سے
مرے کمبخت دل کا حال مت پوچھو ہے تنہائی کا دلدادہ ازل سے
نظر آتی نہیں منزل نہ آئے میری قسمت میں ہے جادہ ازل سے
فنا ہونے بھی دے ہستی کی لعنت! ہے مٹنے پر دل آمادہ ازل سے

تماشا ہے کہ اپنی جستجو میں
ہے سرگرداں دل سادہ ازل سے

امین حزیں

خیالاتِ ہُمایوں

۴۔ ٹکنیکل اور سائنٹیفک تعلیم

مسلمان نوجوانوں کو ٹکنیکل تعلیم دینا روز بروز زیادہ ضروری ہوتا جاتا ہے اور بعض صوبجات کے مقامی حالات کو مدِنظر رکھ کر مجھے امید ہے کہ اگر ہم اس طرف توجہ کریں تو ہماری قوم اس صنف تعلیم میں اطمینان بخش ترقی کر سکتی ہے ہندوستان کے صنعتی ارتقاء نے ایک نیا پہلو بدلا ہے اور یہ خیال کرنا نہایت غلط ہوگا کہ ہم مسلمانانِ ہند کو فی الحال اپنی کوشش ادبی تعلیم تک محدود رکھنی چاہئیے۔ اور اس کے بعد ٹکنیکل تعلیم کی طرف توجہ کرنی چاہئیے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی دلیل کا اطلاق فنونِ فاضلانہ کی تحصیل یعنی طب اور انجینرنگ کے متعلق نہیں کیا جاتا۔ اور مجھے تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ صنعت وحرفت اور عام تجارتی مضامین بھی مسلمانوں کی تعلیم۔ ادبی تعلیم کے پہلو بہ پہلو چلنی چاہئیے۔ آجتک بحیثیتِ قوم ہم نے اپنے حصولِ دولت کی طاقتوں کو تقویت دینے میں بہت کچھ کوتاہی روا رکھی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ ہماری اقتصادی حالت نہایت زبوں اور خطرناک ہوگئی ہے۔ آجکل صنعت وحرفت کا دور دورہ ہے۔ اور میں اُن نوجوانوں کو جو آرٹس کالجوں میں تحصیل علم کرتے ہیں۔ بڑے زور سے یہ صلاح دونگا کہ وہ بمقابلہ زبانہائے جدیدہ اور فلسفہ کے طبیعیات اور اقتصادیات کے مطالعہ پر زیادہ توجہ کریں۔ زباندان یا فلسفی کے مقابلہ میں ایک ماہر طبیعیات تحقیقاتِ علمی کے مفید کام میں زیادہ نمود پاتا ہے۔ اور ہماری قوم کے واسطے آجکل بمقابلہ ایک فلسفیانہ شاعر کے جو اپنے حجرہ کی مدھم روشنی میں زریں خواب وخیال کا لطف اُٹھا رہا ہو ایک ماہر علم مادیات کا وجود زیادہ مفید ہے جس کا ذہن ان واقعات سے لبریز ہو جو اس کی قوم کی مادی بہبودی سے متعلق ہیں۔ اور جس کی عملی تعلیم اُس کو زندگی کی مجسم حقائق سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ قابل بنا دینی ہے

ہمایوں

تُندمزاجی کے بُرے نتائج

دُنیا میں بہتیرے مرد و عورت ادنےٰ درجوں پر محض اس لئے کام کر رہے ہیں کہ وہ اعلیٰ مرتبوں کو اپنی تُندمزاجی کی وجہ سے قائم نہیں رکھ سکتے۔ ہر جگہ بہت سے آدمی ایسے نظر آتے ہیں جو ترقی کر ہی نہیں سکتے کیونکہ انہیں اپنی تیز و زود رنج طبیعت پر قابو حاصل نہیں۔ وہ (برسوں) کی محنت سے کوئی اچھی جگہ حاصل کرتے ہیں۔ مگر کبھی نہ کبھی کمبخت غصہ آگھیرتا ہے۔ اور انکی سب محنت اکارت چلی جاتی ہے اس وقت مجھے ایک آدمی کا حال یاد ہے جو متواتر بیس سال تک ایک اعلےٰ عہدے پر پہنچنے کے لئے سر توڑ کوشش کرتا رہا۔ یہ ایسی جگہ تھی جو اسے ہمیشہ کے لئے مستغنیٰ و بآرام بنا دیتی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ایک تند مزاج آدمی تھا۔ وقت پر کسی سے ناحق جھگڑ بیٹھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اپنے عہدے سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اسی طرح ایک اور آدمی کا حال مجھے معلوم ہے جو بڑے بڑے افسروں اور با اختیار آدمیوں کی سفارشیں بھی رکھتا ہے۔ اور خود بھی کئی دفعہ اعلےٰ اعلےٰ عہدوں پر مامور ہو چکا ہے، لیکن بدقسمتی سے وہ کسی ایک پر بھی کچھ مدت کے لئے قائم نہیں رہ سکا۔ اس کی اس ناکامی کا باعث محض اسکی تند طبیعت ہی ہے جو اسے کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔

ایک عیالدار بوڑھے مگر قابل شخص کے لئے کیا یہ قابل رحم بات نہیں ہے کہ وہ بار بار جگہ کھو کر شرمندگی اُٹھاتا رہے۔ کیا یہ ایک حسرت خیز منظر نہیں ہے کہ ایک اچھا دماغ رکھنے والا اور قابل آدمی۔ زندگی و طاقت سے معمور ہونے پر بھی دوستوں کے دروازوں پر دستِ سوال پھیلاتا پھرے اور اپنے عیال و اطفال کے لئے ان سے مدد کی درخواستیں کرتا پھرے! اور یہ سب محض اس لئے کہ اسے خود اپنی طبیعت پر قابو نہیں!

چند دن ہوئے میری مُلاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو باوجود اپنی مسلمہ قابلیت کے بھی زندگی بھر اپنی تیز طبیعت کے باعث نقصان اُٹھاتا رہا ہے۔ اور تا حال کوئی معتد بہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ وہ کئی دفعہ اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر بھی مامور ہوا مگر انہیں بھی اپنی بے پروائی

سے کھوتا رہا۔ وہ بہت محنتی ہے اور ترقی کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ اب وہ کافی لمبی عمر تک پہنچ چکا ہے۔ مگر اپنی اچھی خاصی قابلیت کے باوجود بھی نسبتاً بہت کم کامیابی حاصل کر سکا ہے۔ وہ اس بات کو دیکھ کر بہت کڑھتا ہے کہ وہ اپنی مسلمہ لیاقت کے باوجود بھی ایک معمولی سے عہدے پر مامور ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنے پیشہ میں اول درجے پر ہونا چاہیئے اور اوروں کی پیروی کرنے کی بجائے اسے دوسروں کا رہنما ہونا چاہیئے۔ اپنے سے کم لیاقت کے آدمیوں کو اسے کچھ کرنے کے لئے حکم دیتے دیکھ کر وہ سخت پیچ و تاب کھاتا ہے۔ لیکن سب لوگ اسکے نقص سے واقف ہیں اس کی تند مزاجی اسکی دنیاوی ترقی کے راستے میں ایسی ہی سد راہ ہے جیسی کہ شراب نوشی۔

ایک نوجوان کے لئے اس سے زیادہ بیوقوفی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ پہلے تو وہ کئی سال اپنی تعلیم پر خرچ کرے اور بہت کوشش سے اپنے پیشہ میں مہارت حاصل کرے مگر جب ایک قابل عزت اور معقول پوزیشن حاصل کرے تو اسے جلدی ہی اپنی تند مزاجی کی وجہ سے کھو دے اگر ایک بت تراش کئی سال کی محنت سے سنگ مرمر کو تراش تراش کر ایک دلکش بت تیار کرے مگر اسکے بن چکنے ہی وہ کسی وجہ سے طیش میں آکر اسے ہتھوڑے سے چند ہی منٹوں میں توڑ پھوڑ کر رکھدے اور پھر دوسرا بنانا شروع کردے تو یقیناً اسے ہر ایک آدمی پاگل خانہ بھیجے جانے کے لائق خیال کریگا لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اس سے بڑھ کر پاگل نہیں ہو؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اپنے سالوں کی محنت اور کمائی چند ہی منٹوں میں اپنی تیز طبیعت کی وجہ سے خاک میں نہیں ملا دیتے۔!

ایسے آدمی جو ذرا سی بات پر طیش میں آجاتے ہیں۔ جو دوسروں کی ہر ایک بات کو اپنے اوپر چوٹ ہی سمجھتے ہیں۔ وہ کبھی بھی اپنے اوپر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اور نہ کبھی وہ اپنے مراتب کو قائم رکھ سکتے ہیں ایسے زود رنج آدمیوں کے ساتھ رہنا سہنا بڑا ہوشیاری کا کام ہے۔ ہر وقت یہی کوشش کرنی پڑتی ہے کہ ہمارے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جس سے وہ بگڑ جائیں۔ کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جسے وہ اپنے اوپر وار ہی سمجھ لیں۔ ایسے ذکی الحس آدمی خود بھی بہت دکھ اٹھاتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی بہت تنگ کرتے ہیں۔ ذکی الحس ہونا درحقیقت ایک بڑا نقص ہے۔ اور غرور۔ نخوت و خود غرضی اسکی جڑ ہے۔

ایک کارخانہ کے مالک کو بہت ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب اسکے مزدوروں میں کوئی ایسی لڑکی بھی ہو جو بہت ہی ناز و آرام سے پالی گئی ہو۔ اور جو ذکی الحس و شوخ طبع ہونے کے ساتھ ہی اپنی روزی کے لئے

محنت کرنا باعث عار سمجھتی ہو۔ ایسی لڑکی ہر وقت خیال کرتی ہے کہ لوگ اسکو دھوکا دے رہے ہیں اور اسکی توہین کرتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر وہ از حد رنج و مصیبت کا احساس کرتی ہے۔ چاہے کوئی جان بوجھ کر اسے بالکل کوئی دل آزار کلمہ ہی نہ کہے۔ درحقیقت جس قدر دُکھ درد ایک ذکی الحس آدمی محسوس کرتا ہے اسکا زیادہ تر حصہ اسکی اپنی ہی طبیعت کے نقص کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کوئی جان بوجھ کر اسے اس قدر دُکھ نہیں دیتا۔ اور دوسرے آدمی ایسی باتوں کو محسوس تک بھی نہیں کرتے۔ یہ کس قدر باعث شرم ہے کہ انسان کو اپنے اوپر قابو نہ ہو اور وہ ہر وقت یہ محسوس کرتا رہے کہ باوجود اسکے نیک ارادوں اور سخت محنت کے بھی اس کی زود رنج طبیعت اسکی ساری محنت کو دم بھر میں خاک میں ملا سکتی ہے۔ انسان کو اپنے اوپر پورا اعتماد ہونا چاہیئے۔ انسان کو نہ صرف یہ خیال کرنا چاہیئے بلکہ یقینی طور پر جاننا چاہیئے کہ وہ ہر حالت میں اپنی طبیعت کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ جو انسان اتنا نہیں کرسکتا وہ کبھی بھی خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکتا اپنی طبیعت کو قابو میں کرنا اور اس پر پورا تسلط حاصل کرلینا پہلے پہل بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب تم اپنی زود رنجی کے اسباب کا تجزیہ کرو۔ تو تم دیکھو گے کہ یہ ایسے اجزا سے مرکب ہے۔ جن پر فرداً فرداً قابو حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں اور پھر مجموعی طور پر طبیعت پر قابو پالینا بھی آسان معلوم ہونے لگتا ہے۔ حسد تند خوئی کا ایک حصہ ہے ایسا ہی دوسروں کے خیالات و رائوں کی پروا نہ کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ قاعدۃً ایک تند خو آدمی ظالم۔ خود غرض و مغرور و متکبر ہوتا ہے۔ وہ اپنے سوا کسی اور کو خیال میں بھی نہیں لاتا۔ دوسروں کے حقوق اسکے نزدیک کچھ وقعت نہیں رکھتے۔

ہر ایک آدمی کے دل میں دنیا میں ایک با اقتدار آدمی بننے کی خواہش ہونی چاہیئے اور اسکے اندر ادنیٰ حالت سے ترقی کرکے بلند مرتبے پر پہنچنے کا زبردست جذبہ ہونا چاہیئے۔ لیکن جبتک وہ اپنے اوپر پورا قابو حاصل نہیں کرسکتا وہ لوگوں کو اپنی طاقت محسوس نہیں کرسکتا۔ جبتک وہ اپنی طبیعت کو قابو میں نہیں لاتا وہ حالات یا لوگوں پر کبھی بھی اختیار نہیں پا سکتا جو آدمی انتظار کرسکتا ہے خواہ یہ کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ جو اشتعال دلائے جانے پر بھی پرسکون رہ سکتا ہے۔ جو ہر حالت میں باآرام رہ سکتا ہے جو اسوقت بھی اپنی طبیعت کو قابو میں رکھتا ہے جبکہ اسکے چاروں طرف غصے و شور و فساد کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ الغرض جو شخص کسی حالت میں بھی سکونِ قلب کی باگ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا وہ اس قابل ہے جس پر لوگ بھروسہ کریں۔ وہ ہی شخص ہے جسکی لوگوں کو ضرور عزت کرنی پڑتی ہے۔ اور جو حالات اور لوگوں پر بھی حکومت کرسکتا ہے۔ اور انہیں قابو میں رکھ سکتا ہے۔

(ترجمہ) گوتم دیو

خیالات

راتوں کے سناٹے میں

راتوں کے سناٹے میں جب مَیں تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ تو فطرت کے نرم و نازک جذبات میرے دل میں لہریں لیتے ہیں! .... محبت اپنی کہانی کہتی ہے اور نفس اپنا دُکھڑا سناتا ہے حسن شوخی کو ہمراہ لئے اداؤں کے ساتھ کھیلتا ہُوا چلا جاتا ہے۔ اور مستی آنکھیں بند کئے فضا کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتی ہے" اِدھر انسان کی بستی کے چراغ ٹمٹماتے ہیں۔ اور کاروباری دُنیا عالم خواب میں تبدیل ہُوا چاہتی ہے۔

مَیں تاریکی کے غیر انجام صحرا پر نظر دوڑاتا ہوں اور قضا و قدر کے پیچیدہ مسئلے مجھے اپنی اُلجھنوں میں جکڑ لیتے ہیں وہ دُنیا جو دن بھر اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی تھی شبستانِ تنہائی میں گمنامی کے پردے کے پیچھے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اب سُورج کی بھٹکتی ہُوئی کرنیں اُسکے کھلے ہُوئے چہرہ پر نہیں پڑتیں اور میں اندھیری رات میں اپنے تئیں اپنے نت نئے خیالوں کے ساتھ تنہا پاتا ہوں۔ وہ نئی نویلی صورتیں اختیار کرتے ہیں اور میرا دل انکی موجودگی میں زندگی کی کاوشوں کو بُھول جاتا ہے!

میں تاروں بھرے آسمان کی طرف پھر دیکھتا ہوں اور راتوں کے سناٹے میں میرے سامنے حسن کا اک دلپسند نظارہ اپنا جوبن دکھاتا ہے۔ اُسکے بال فضا کی لا انتہا تاریکی میں بکھر جاتے ہیں اور کہکشاں کی مانگ اُنکے بیچوں بیچ دکھائی دیتی ہے۔ اسکی آنکھوں کی چمک تارے تارے میں ٹمٹماتی ہے۔ اور اُسکے چاند سے مکھڑے پر شبنم کے نرم و نازک آنسو ٹپکتے ہیں۔ تنہائی پھیلی ہُوئی فضا میں خاموشی کے ساتھ ناچ رہی ہوتی ہے۔ اور موسیقی اپنا ساز اُٹھائے حسن کے سامنے گلدستہ سخن کو کھول کر ہوا میں چاروں طرف اسکی پنکھڑیاں بکھیر دیتی ہے، ایسے وقت میں مَیں نہیں جانتا کہ وہ کونسا تحفہ پیش کروں جسکی بدنمائی اس حسین منظر کو اک خوابِ شیریں کی طرح درہم برہم نہ کردے ـــــــ آخر وہ بے غرض اور پاک و صاف محبت کی لہر جو ہر شئے میں اُٹھتی ہے میری متوالی آنکھوں سے ہمدردی کے دو آنسو ٹپکاتی ہے اور یہ بھولے بھالے عشقِ حقیقی کے تاروں کو چھیڑ کر آسمانوں کے گنبد کو اپنی میٹھی اور سُریلی گونج سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے معمور کر دیتے ہیں!!!

د۔ ب

مضامینِ طفلی

رہبرِ ہند لاہور - دوشنبہ - ۲ جنوری سنہ ۱۸۸۱ء

لاہور دہلی دروازہ کی زیب النسا کا مضمون جسکا عنوان "رسوم ہند" ہے مراسلات میں چھاپا جاتا ہے بہ سال کے ابتدا ہی میں اس مضمون کے چھاپنے سے یہ کہنا یہ ہے کہ سب سے پہلا کام اچھے لوگوں کا ہندوستان میں یہ ہے - کہ رسوم کی تہذیب کریں -

پیاری زیب النسا اگر درحقیقت عورت ہے - تو بلا کی عورت ہے اور ہم اسکی لیاقت کی داد دیتے ہیں - جو اس وقت کی عورتوں کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتی ہے اور اگر فرضی عورت ہے - تو ہم اسکے دلاویز اور دل پسند فرض کی تعریف کرتے ہیں - لیکن افسوس ہے کہ باوجود ہمارے متقاضی ہونے کے مکرر صاحبہ یا صاحب موصوف نے ہمکو اپنے سے آشنا نہیں کیا - جو نہایت ضروری ہے - گو مضمون میں یہی ظاہر کیا ہے - کہ گویا اپنا نام نامی بلکہ حسب و نسب تک ہم پر واضح کر دیا ہے بوجہ گمنامی یہ مضمون قابلِ اشاعت نہ تھا - مگر ہم مکرر اُس کے مفید عام ہونے کا لحاظ کرتے ہیں - نیز اس شک کی وجہ سے کہ شاید کوئی ثقہ اسکے لکھنے والی ہے اندازے بڑھکر اسکی قدر کرنا چاہتے ہیں رسوم کی اصلاح نہایت ضروری ہے اور یہ نہایت غلط خیال پیدا ہو رہا ہے، کہ آباو اجداد سے رسوم کی یہی حالت تھی - رسمیں وقت کی تہذیب کے مطابق بہتر طور پر اور فواید کے واسطے قایم ہوتی ہیں - لیکن جب قوم تنزل کرتی ہے تو رسوم میں خرابی یا افراط و تفریط ہو جاتی ہے - ہم جب اکثر رسوم کی بنیاد پر تعمقِ نظر کرتے ہیں تو منجملہ ان کے اکثر کی وجہ یا ضرورت معلوم ہو جاتی ہے اور قطعاً ثابت ہو جاتا ہے - کہ من بعد ان میں افراط یا تفریط ہوئی ہے - خواہ کوئی رسم اُس زمانے کی باقی ہے جبکہ قوم نے ہنوز ترقی نہ کی تھی - پہلی صورت میں اصلاح ضروری ہے اور دوسری صورت میں تنسیخ یا ترمیم - رسوم ایک قانون ہے جسے ہمیشہ حسبِ حال بنالینا ہمارا اولین کام ہے - اور اُسکی تنسیخ یا ترمیم یا تبدیلی کی وجہ سے ہم پر کوئی طعن نہیں ہو سکتا -

رسوم ہند

اڈیٹر صاحب - اس بے قدر[1] مضمون کو جو میری تر دامنی کی حیثیت سے سراسر ایک زاہد خشک سے

[1] اس سے پہلے اخبار رہبر ہند مطبوعہ ۱ مئی سنہ ۱۸۸۱ء میں میرا ایک مضمون در بارہ رسوم ہند شایع ہو چکا ہے - ناظرین کو چاہیئے کہ قبل اس آرٹیکل کے پڑھنے کے اُسکا بھی ملاحظہ کر لیں کیونکہ ان دونوں کا آپس میں کچھ تعلق ہے -

نسبت رکھتا ہے، اپنے اخبار کے کسی کونہ میں جگہ دیجئے۔ شاید کچھ گوشہ نشینی کچھ صحبتِ نیک[1] کی برکت سے ملک ہند کے
گم گشتگاں بادیۂ بے شعوری کا رہنما بن جائے ؎

ہیں مانع فروغِ ترقی رسومِ ہند
کرتی ہے گل چراغ یہ بادِ سمومِ ہند

قبل ازیں کہ میں گردشِ گردوں خیالاتِ پشینہ و اخترِ بے اصولیت حالاتِ دیرینہ کی ماری بے سروپائے کے چکر
میں طائر قبلہ نما کی طرح ہوائے ہوا خواہاں اخلاص میں پھر اشتیاق پھڑپھڑائی گلشن مصلحت احباب میں برگِ گل مراد
پُرجوش الحانی سے چہچہائے آشیانہ اصلاح کیجانب رُخ کروں۔ غنچۂ تنگ طلبی دل سے ایک سخن نکہت برباد کی طرح
موج صبائے شوق اظہار پر سوار طایر خبر کی صورت پر پرواز رشتہ سکوت سے نہیں بندھوا تا۔ وہو ہذا کہ آپکے
اخبار رہبرِ ہند مطبوعہ ۱۰ رمئی ۱۸۹۱ء میں جس کی ایک ایک سطر گمراہان بادیۂ ظلمت و جہالت کے واسطے
گویا مشعل نورِ علمیت اور فرعون طبعان خطہ متکبری کے لئے عصائے موسیٰ کی طرح اژدہائے کبر شکن طبیعت ہے
میرا ایک مضمون جو شایع ہُوا تھا میری نظر سے گذرا۔ گو نو عروس خیال تفریح احباب و ارباب خرد پرور کرشمے پر
کرشمے لگاتا ہُوا ہمکنار رہُوا۔ مگر ساتھ ہی رقیب روسیاہ افسوس کا تیر غیرت کہ اس جانِ جہاں کے پیچھے "چوں مرگ
در قفائے عمر" آتا تھا۔ کلیجے کے پار ہُوا۔ یعنی آپ نے جو اپنے اخبار میں لکھا تھا۔ کہ "ہمارے پاس ایک بے نام و
نشاں آرٹیکل پہنچا ہے۔ اور ہم کبھی اُسے درج اخبار نہیں فرماتے۔ مگر ہاں نظر بر آنکہ اس میں فایدۂ عوام متصور ہے
ہم اُسے شایع کر دیتے ہیں۔ میرے قیاس میں شاید آپکی توجہ نے میرے اُس آخری شعر سے جو میں نے بجائے
نام را در فی الحقیقت اُس سے میرا نام ہی نکلتا تھا" لفظ الراقم" کے ہم پہلو لکھا تھا پہلو تہی کی ہے۔ ورنہ آپ
ضرور سمجھ جاتے کہ یہ میرا نام ہی تھا۔ خیر گذشتہ را صلوات۔ آیندہ میں اپنا نام (گو مجھ پر کچھ ایسا لازم نہیں کہ
میں اپنا نام لکھوں کیونکہ میرا مضمون محض متضمن بہ فوایدِ عوام ہے) ظاہراً لکھا کرونگی۔ اور تادم مضمون نویسی
آپکے ارشاد کی تعمیل کا دم بھرونگی۔ لیجئے اِدھر توجہ کیجئے۔ اب میں آپ کو کل رات کی ایک سرگذشت سر تا
پا سناتی ہوں۔ گویا اپنے مضمون کی ہر ایک سطر میں "چوں در بزلف عروس" نقطے لگاتی ہوں یعنی کل شب
عین عشا کے وقت کہ کہکشاں گہرہائے انجم جفاکیشی سے مرصع سر عالم پر کھینچی۔
خوبان ہند کی مانگ کی طرح ایک ایک کے دل پر بے سروپائے کے زخم لگا رہا تھا۔ میں دشتِ

[1] صحبتِ نیک سے اڈیٹر صاحب کی رائے مراد ہے۔ امید واثق ہے کہ آپ بھی کچھ رائے لگائینگے۔

ہویدائے اشتیاق میں پیر سفید ریش کی مانند اُس آرائش محفل کی ترنگ میں ' ایک بار دیکھا ہے دوسری دفعہ دیکھنے کی ہوس ہے" باواز بلند کہہ رہی تھی۔ شمشیر دورنگیٔ گردونِ دوں کا زخم بزخم دیرینہ آبردئے پری خواب پیشینہ کے تصوّر میں مانند سنانِ غم برسینہ سہہ رہی تھی کہ فی الحال حاتم خواب پری غنودگی کے وسیلہ سے سرنوشت ازل کی حسن بانو کا بھیجا ہوا میری خوش اقبالی کی راہ راست پر قدم بڑھائے۔ ادھر تشریف لایا۔ مجھ برشتہ جگر کو آتش غم فرقت پر بے قرار دیکھکر از رہ غمخواری چشم میں اشک حسرت ڈبڈبا فرمایا" صاحبہ کیوں اتنا اضطراب ہے؟ کس لئے دل پژمردہ اسقدر بیتاب ہے؟ ذرا دم کے دم برائے خدا اشکباری سے دم لیجئے۔ دل اندوہگیں کی بے قراری کچھ نہ کچھ کم کیجئے۔ برنگِ صدف لب بستہ سے مہر سکوت اُٹھائیے۔ گوہر مضمون باعثِ غم مجھے بھی دکھلائیے غرض جونہی ایسے ایسے تین چار کلمات فرحت آثار کی نسیم بہار مجھے بے قرار کی گلزار استماع تک پہنچی۔ عین اُس حالت میں کہ چشم اشکبار بر بہار کی طرح جوش گریہ میں دیکھنے والوں کو رُلاتی تھی۔ اور دل مضطر کی بیقراری برق طپاں کو غیرت سے چلو پانی میں ڈباتی تھی۔ غنچۂ دل نے چٹک گل خنداں کی طرح کہا تو یہی کہا کہ "اے کرمفرمائے مشفق! گلستان ہندوستان میں جدھر دیکھتے ہیں۔ مرادوں کا چمن لہلہاتا نظر آتا ہے۔ مگر ہاں اک آرائش[1] محفل کی گل ماہتاب کا خار جدائی جسے کچھ مدت پیشتر ایک شہسوار سبز پوش کی عنایت سے عین جلوہ افروزی میں دیکھا تھا دل میں کھٹکتا ہے۔ لیجئے اسکے نکالنے کی کوئی تدبیر کیجئے۔ ایسا جواب درد انگیز سُنکر جس کے لفظ لفظ سے وحشت خیزی پانی کی طرح قطرہ قطرہ ٹپکتی تھی۔ وہ مرد خدا جسے مشفق رہنما کہنا بجا ہے ہمدردی سے دریائے کرم کی طرح جوش میں آیا۔ منہ سے تو کوئی تسکین بخش کلمہ نہ فرمایا مگر آہستگی سے اپنے ہاتھ کو میری طرف ایسا بڑھایا کہ چھوتے ہی (مجھے ایسا ہی کچھ معلوم ہوا تھا) میری ہوش طائر روح کی طرح پرواز کر گئی۔ ایک دو ساعت کے بعد آپ سے آپ (خدا جانے کیا طلسم تھا) قسمت بیدار کی طرح میری آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا تو نہ اپنا شہر ہے نہ میری وہ حالت ہے۔ نہ وہ جوان مرد ہے مگر ایک پرفضا باغ کی عین وسط میں ایک نایاب حوض کے کنارے کہ ساقی قدرت کی صنعت سے ساغر کی طرح سنگ مرمر کے چبوترے پر دھرا پیمانہ عشرت کی طرح بھرا تھا میرے پاؤں پانی میں لٹکتے ہیں۔ ادھر ایک فوارے سے جو اُس حوض کے کنارے کسی مست نازکی ساق سیمیں کی طرح بارانی کی جالی سے ڈھپا تھا۔ خوش مستی کے قطرے ٹپکتے تھے۔ اُدھر

---

[1] آرائش محفل کی گل ماہتاب سے ظہور الدین صاحب مراد ہیں۔ جو میں نے ذرایع معتبر سے سنا ہے کہ ایک گونہ اس امر نیک یعنی رسوم قبیحہ کی استیصال کے گرد ونواح لاہور میں ابانی گنے جاتے ہیں ؛

چاروں طرف قسم قسم کے خوش نوا پرندے عجیب عجیب پھولوں پر آوازِ قطرات کی دم کشی پر چھلکتے تھے۔ یہ قدرت کی گلکاریاں دیکھ کر بھلا اب حضرتِ دل کو تاب کہاں تھی۔ ہاں اشتیاق ناشکیبا کے ہاتھ اپنے اختیار کی عنان تھی کہ جدھر چاہتا۔ لے جاتا۔ ایسی ایسی قلمکاریاں دیکھیں کہ مانی جی تو بالائے طاق اگر مصوّرِ خیال بھی (اوّل تو ممکن ہی نہیں) مشاہدہ کرے تو نقشِ دیوار کی طرح ششدر رہ جائے۔ اللہ کے سوائے کچھ یاد نہ آئے الغرض نسیم صبح کی طرح چار طرف صنعت ایزدی کی گلزار میں پھرتے پھرتے آخر (خدا کی شان دیکھی) خوش قسمتی کی رہنمائی مجھے اُسی حوض کے کنارے لا ٹھیرایا جو خواب پیشینہ میں نظر آیا تھا۔ سامنے آنکھ اُٹھا کر جو دیکھا تو وہی کروفر اور طمطراق کے ساز و سامان دکھائی دیئے ذرا اور توجہ سے جو آگے قدم بڑھایا تو ارغنوں کے سے نغمے سُنائی دئے ادھر پہلے ہی سے اشتیاق نے حضرتِ دل کو سکھا پڑھا کچھ ایسی فسوںسازی کر رکھی تھی۔ کہ اُدھر سے پُرانے مزے کی بُو آتے ہی رُوح سراپا آرزو ہو گئی مجھے بھی شوقِ نظارہ کے طلسم نے بلایا اور پلک مارتے وہاں جا پہنچایا۔ اِدھر طائرِ نظر نے جھٹ اپنے پرانے صفیروں کو خوش اسلوب نرالی وضع سے جان لیا۔ اُدھر صدر نشین مجلس نے بھی مجھے پہلی نظر ہی پہچان لیا۔ جو زرنگار یا کرسی مجھے پہلے عطا ہوئی تھی۔ اب بھی وہی دے کر خوب تواضع سے فرمایا کہ آئیے بیگم! میری بائیں طرف بیٹھ جائیے۔ گو ایسی رہنمائی بزرگوار کے پاس بیٹھنا کہ گل خورشید کی طرح منبع نکہت باغ عالم تھے۔ پاس ادب سے باہر تھا۔ مگر یہ سوچ کر کہ خط فرمان سے سرکشی کرنا راہ گستاخی میں پاؤں دھرنا ہے۔ گل و خار کی نسبت سمجھ کر "فی الحال بسر و چشم" کہہ کر اُنکے پہلو میں جا بیٹھی۔ اپنے بائیں دائیں جو نظر کی تو کیا دیکھتی ہوں کہ اصلاح۔ تدبیر اور عقل بھی میرے پاس ہی خوب آن انداز سے بیٹھے ہیں۔ اور ادراک جی تو عین حضرت علم کے مقابل تھی۔ اُن سے بڑھ کر آگے وہی دانشمند پُرانی بیوقوفیوں کے زریں[1] دوپٹے اوڑھے جن کی سفید جھالروں پر کچھ کچھ دھوئے ہوئے داغوں کی نمود تھی۔ صف کے صف باندھے بڑی توجہ سے بیٹھے ہیں۔ مجلس کے عین وسط میں وہی بالیاقت نوجوان ایک خُردبین لگائے حضرتِ علم[2] کے روبرو بیٹھا اپنے ہمنشینوں کے دوپٹوں کی جھالروں کی کسی باقیماندہ آلودہ تار کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گذری ہوگی کہ ہمارے پیچھے سے دور کچھ شور سا اُٹھا ایسا کچھ معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا بہت سے اشخاص باآواز کہہ رہے ہیں۔ کہ چلو چلو دیکھیں تو بھلا کیا جواب دیتے ہیں۔ ایک آن

---

[1] زریں دوپٹوں کے عادات و اطوار حسنہ جو کہ رسومات قبیحہ کی تنسیخ سے پہلے برائی کی آلائش سے آغشتہ تھے۔ مگر جب رسمیں چھوڑ دی گئیں تو گویا اصلاح کے پانی سے دھوئے گئے [2] ظہور الدین صاحب سے مراد ہے جواب بھی کچھ کچھ باقیماندہ رسوم کو استیصال میں مصروف ہیں

کی آن میں خوب لمبے چوڑے آدمیوں کے غول طبل کی طرح شور مچاتے ہمارے نزدیک آ پہنچے۔ ہم سب کی یہ ناہنجار طریق دیکھ کر اُدھر متوجہ ہو گئے کیا دیکھتے ہیں کہ اُن اشخاص کی رہنما ایک بڑی بداطوار عورت بیحیائی کا پردہ چہرہ پر ڈالے اپنے جوبن پر مغرور خراماں چلی آتی ہے۔ مُنہ پر داغہائے چیچک کے باعث خانہ زنبور کا عالم تھا۔ ایسا ماتم ایسا عالم کہ زنبوران نیشزن نفرت شاید اپنے بچے وہیں پالا کرتی تھی آنکھوں میں سفید سفید پھپھولے تھے[1] جنکے باعث وہ اپنے سامنے دو قدم سے دور نہیں دیکھ سکتی تھی۔ پاؤں میں بڑے بڑے کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھونڈی صورت کسی دشت خاردار کی چڑیل کہیں سے ماری ماری آئی ہے۔ گو وہ حمام کی صورت۔ شیطان کی خالہ قحبۂ بازار کی طرح موجب نفرت تھی۔ مگر ہزارہا بے شعوروں کی آنکھوں میں جو اُسکے پیچھے افتاں و خیزاں شتران بے مہار کی صورت چلی آتی تھی۔ نور کی طرح سمائے یوسف مصر سے بھی اُس کی خواہش کی فزوں ترگرم بازاری تھی۔ آتی ہے شہزادی عقل کے مقابل (جہاں اُسکے لئے پہلے سے ایک ٹوٹی پھوٹی حضرت نوح کے زمانے کی کُرسی بچھی تھی) بیٹھ گئی۔ میری تو اُس سے بالکل جان پہچان نہ تھی۔ کُرسی کو سر کا اصلاح سے پوچھا ئیے کہو۔ تو بوا! یہ کون شریف زادی معاذ اللہ غلط گفتم۔ کون شریر زادی ہے۔ جواب دیا۔ " اوہو۔ تم نہیں جانتیں؟ اُسکا نام حماقت ہے۔ کئی برس سے اکثر ہمارے ہمنشیں عقل سے مختلف باتوں پر جھگڑنے آیا کرتی ہے۔ چنانچہ آج یہ سُن کر کہ ہم نے قدیم رسوم ہند جن سے ہماری ترقی کی بیخکنی تھی منسوخ کر ڈالی ہیں۔ ہم سے بحث کرنیکو تشریف لائی ہیں۔ دیکھو تو کس طرح چٹکیوں پر اُڑاتی ہیں۔ ادھر سے ابھی استفسار ہی تھی کہ اُنکو بحث شروع ہوتے ہی حاضرین مجلس نے اُدھر کان لگائے۔ پہلے پہل حماقت صاحبہ شہزادی عقل کے سامنے اپنا اعتراض یوں پیش کرتی ہیں۔ کہ

کیوں بی! آپ نے ان باسلیقہ رسومات میں جو کئی زمانوں سے ہمارے اسلاف میں مروج آتی ہیں۔ (اور جن پر ہمیں ویسا ہی عمل کرنا چاہیئے کیا بُرائی دیکھی ہے۔ کہ اُنکے استیصال میں یہاں تک بیباکانہ قدم بڑھایا ہے؟ کیا ہمارے آباؤ اجداد جن کا فضیلت کے مرتبہ کو پہنچنا ہمیں ثابت ہے اتنی بات نہیں سمجھتے تھے یا اس قدر قابلیت نہیں تھی۔ کہ اپنی رسومات متداولہ کو کچھ اپنے حق میں مضر سمجھ کر (جیسا کہ آپ کی خام خیالی ہے) بالکل چھوڑ دیتے؟

حالانکہ آدم سے تا ایندم یہی رسوم مروجہ سینہ بسینہ چلی آتی ہیں اور ان پر کوئی دانشمند معترض نہ ہوا۔

---

[1] ہاں بے شعور لوگ دوربینی نہیں کر سکتے۔

مگر ہاں آج آپ نے (جن کو اس بات میں محض ناواقف کہہ سکتے ہیں) ایک چھوٹی سی میٹنگ میں بلکہ ان کے
استیصال کی جرأت کی ہے۔ دیکھو تو کیسے سارے جہاں کے تیر تیر سلامت کے ہدف بنتے ہو۔ "شہزادی عقل)
وہ چہ خوش۔ بی صاحبہ! آپ نے کیسا باصواب اعتراض نکالا ہے۔ جس کی نسبت ہم بعینہ یہ مثال دیتے ہیں۔
کہ گویا ایک بستی سے چند کوس کے فاصلہ پر ایک تکیہ میں جو ایک بدطینت فقیر[۱] کا ہے۔ ایک کنواں کھدا
ہے۔ زمانہ سلف میں ایک شب اتفاقاً ایک مجنوں شخص نے جس کو عوام الناس مجذوب سمجھ کر پیر جی
کہتے تھے۔ اور جس کا مسکن بستی مذکور ہی تھا۔ چند اشخاص کے برانگیخت سے جو اکثر اس کے چاؤ سے چاہ
مذکور میں جہاں قبل اسکے شاید کوئی فرد بشر غوطہ زن نہیں ہوا تھا۔ ڈبکی مارنے کا عزم باندھا۔ کنواں تو بہت
عمیق تھا۔ پیر جی تو بسم اللہ ہی میں وہیں رہے۔ مگر اس بات کی تمام بستی میں شہرت ہو گئی۔ اور ہر ایک تو
یہی سمجھا کہ ہمارے پیشوا دم آزمائی کے لئے ابھی تہ آب میں لگ رہے ہیں۔ ریس نے جو راست راست
شیطان کی خالہ" کے نام سے مشہور چلی آتی ہے۔ قوم کے اکثر بہادروں کو دم دینا شروع کیا۔ کہ حیف ایسی
زیست پر پیر جی تو تم سے بہت بڑھ گئے۔ ایسی بدنامی کا دھبا تو ان کو بھی دامن عزت پر لگانا ناگوار تھا۔
ہاتھ لگاتے ہی وہ موم کی پتلی ادھر سے ادھر ہو گئی اور فوراً آگے پیچھے سب کے سب افتاں و خیزاں
اُس کنوئیں میں (جبکہ فقیر مذکور للکارتا[۲] جاتا تھا کہ ہاں ہاں۔ چلے چلو) دھم دھم کود پڑے۔ چونکہ ہزار ہا
لوگ پس و پیش اس عمیق کنوئیں میں بڑی چاہ سے گرے تھے اس لئے اُن سب کے جمع ہو جانے سے وہاں کا
پانی (جیسا کہ ایک برتن میں جس کا پانی کنارے سے بہت نیچا ہے اگر تم اُس میں کسی مقدار کی شئے ڈالو گے تو
چونکہ شئے مذکور نے پانی کو ہٹا کر اپنا گھر کر لیا ہے۔ ضرور اُس چیز کے انداز کے بموجب پانی اونچا ہو گا۔ اور
اُس حالت میں جبکہ وہ چیز بڑے مقدار کی ہو گی۔ برتن مذکور لبریز ہو جائیگا) اونچا ہوتا گیا۔ اور بستی والے یہی
سمجھتے رہے کہ اب یہاں کا پانی (حالانکہ وہ اتنا ہی گہرا تھا) کچھ عمیق نہیں ہے۔ اور تاہنوز وہ بھی کچھ شہرت کی
خواہش سے کنوئیں میں گرتے رہے۔ اب بی صاحبہ! آپ کہئے کہ کیا بات بستی والوں کے حق میں زہر ہلاہل سے
بھی زیادہ مضر نہ تھی؟ کیوں نہیں اس میں بڑے بڑے دانشمند بھی (جیسا آپکا قول ہے) ہونگے مگر اُس

۱؎۔ بستی سے مراد ملک ہند یا دنیا سمجھو۔ اور "فقیر بدطینت" شیطان سے مراد ہے۔ اور کنوئیں سے رسومات قبیحہ مراد ہیں۔
۲؎ ہاں ایسے موقعہ پر شیطان رجیم لوگوں کو اُس کام کی طرف راغب ہونے کے لئے جو ان کے حق میں مضر ہوتا ہے میٹھی
زبان سے کہتا ہے "ہاں چلے چلو"

صورت میں جبکہ تمام آوے کا آوا بگڑ گیا ہو اور اسلاف کی پیروی کا صیاد گھات میں لگ رہا ہے۔ تو ایسے ایسے ذی شعوروں کی چشم دُور بینی کے آگے اپنی ہی آنکھ کے پردے حجاب ہو جاتے ہیں۔ کیا اس حالت میں جبکہ اس قسم کی شہرت کی رغبت نے سب کی زبان بند کر رکھی تھی۔ وہ کسی قسم کے معترض ہو سکتے تھے؟ یا بالفرض اگر من قبیل اُن کے کسی نے کچھ پختہ اعتراض بھی کئے تو نقار خانے میں طوطی کی کون سُنتا ہے؟ میرا جو ایک دن صبح ہی اس طرف گزر ہُوا۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ اُس کنوئیں میں ہزارہا لوگ زن و مرد گرے ہیں۔ کوئی مردہ پڑا ہے کوئی سسکتا ہے۔ کسی کو دم لینا مشکل ہے۔ کسی کا پیٹ پانی سے پھولا ہے چونکہ چاہ مذکور کے پانی کا بہت سا حصہ (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) اشخاص مذکور کے باعث اونچا ہو کر کناروں سے اُچھل چکا تھا۔ اور کچھ باقی تھا۔ اس لئے تمام لوگ کنارے پر کھڑے پانی سے بخوبی دکھائی دیتے تھے۔ میں نے جب خلق خدا کی ایسی تباہی دیکھی تو کلیجہ پکڑ کر رہ گئی۔ مگر پھر یہ خیال آیا کہ مبادا میری اتنی تاخیر میں کوئی بندۂ خدا اس میں ڈوب مرے۔ یہ سوچ کر بستی مذکور میں پہنچی اور بہت سے ذی شعور اشخاص کو من جملہ جن کے یہ چند دانشمند میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ اپنے ساتھ لائی اور چاہ مذکور کے کنارے پر کھڑے ہو کر ان سب کو احوالِ گذشتہ اور اشخاص مستغرق کی بُری حالت سے مطلع کیا۔ انہوں نے جاتے ہی اپنی بستی کے عوام الناس کو یہ خبر وحشت اثر سُنائی اور ناصح مشفق کی طرح ان کو اس طرف سے منہ موڑنے کی ترغیب دی کچھ تو سمجھ گئے مگر بہت سے (ان اشخاص کی طرح جو آپ کے پاؤں پر پاؤں دھرتے ہیں۔ اور پرانی لکیر کے فقیر ہونے کے اشتیاق میں ڈوب رہے ہیں) انکی نصیحت مصلحت آمیز کو گوش ہوش سے نہیں سُنتے۔ خدا کیلئے بی صاحبہ! اب انکی پیشوائی چھوڑو اور افغانستان کے سبزپوش پہاڑوں کی طرف مُنہ موڑو۔ جبتک آپ درۂ خیبر کی راہ تشریف نہ لیجائیں۔ تہذیب جو آجکل بچارے ہندوستانیوں کی غمخوار بننا چاہتی ہے۔ کبھی یہاں قدوم فیض نہیں فرمائیگی۔ جب شہزادئ عقل اپنی تقریر پُرتاثیر کے خاتمہ پر فل سٹاپ دے چکیں تو حماقت صاحبہ نے پھر کامہ کی طرح زبان کج بڑھائی۔ مگر جب جواب میں ایسے ایسے نکتے سُنے کہ آخر پیریڈ کی طرح اختتام کلام میں منہ نقطہ سا بناکر خاموش رہ گئیں۔ اُدھر تو بقول "جھوٹے کا علاج خاموشی" "شہر خموشاں" کی طرح سکوت کا عالم تھا۔ اور ادھر بفحوائے "سچے پر مبارکباد کی بوچھاڑ" سارے محفل نشینوں کی تہنیت کے شور سے سارا باغ گونج اُٹھا۔ ہماری نظر میں تو شب تاریک کی چادر نے سارے عالم کو مستور کر رکھا تھا۔ مگر فی الحقیقت اس طرف صبح صادق کا نوری حجاب حیا کے پردے کی طرح تمام جہان کو ڈھانپے تھا۔ اِدھر میرے مُنہ سے مُبارک

پر مبارک کے کلمے نکل رہے تھے۔ کہ اُدھر سے کسی خواص نے آواز دی کہ بیگم! کس نیند سوتی ہو! اُٹھو اُٹھو کہ پنجۂ خورشید دستِ وحشت کی طرح گریبان سحر چاک کئے دامنِ افق کی دھجیاں اُڑائے۔ شعاع کی تار حنائی اُنگلیوں میں لٹکائے اونچا ہُوا چلا آتا ہے۔ آپ بھی دست دعا اُٹھائیے۔ ایک تو اس باغ دلکشا میں اُن گلستان شعور کی گلچینوں کے ساتھ سرور کے عالم میں مبارکباد کے گلچھرے اڑا رہی تھی۔ کہ ایک اس ناگہانی آواز کے سُنتے ہی ہی تصویر کی صورت حیرت کے دریا میں ڈوبی کہ ہیں! کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ مگر ساتھ ہی اس طرح کا معاملہ جی میں کھٹک گیا اور سمجھے کہ الحمد اللہ تاہنوز وہ مردان دین اس کار عظیم کے سر کرنے میں "سراز پا نشناختن" کی سی کوشش میں لگ رہی ہیں ہاں آہستہ آہستہ کامیاب ہی ہونگے۔ اور اس با نتیجہ کامیابی کے فواید گلزار شہرت کے پھول ہو کر بقائے دوام کے دربار میں ایک نوجوان کے گلے میں ہار ہو کر لٹکینگے۔ اُٹھو اُٹھو۔ اے میرے ہموطنوں! کس نیند سوتے ہو دیکھنا! دیکھنا! اُدھر مغرب کی طرف جہانتک نظر کام کرتی ہے۔ کیسی برق کی سی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ کہ آنکھ سامنے نہیں کر سکتے۔ ادھر مشرق کی طرف بھی آنکھ پھیرنا۔ ہاں وہ سامنے کچھ دھیمی دھیمی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ بھاگنا! بھاگنا! کہ شمال کی طرف ایک گرد باد آتشیں چڑھا چلا آتا ہے۔ خیر گذشت! کہ وہیں جل جلا کر رہ گیا۔ دیکھنا! ہمالیہ سے پرے پرے کیسی ماہتاب ہے۔ ایلو! ادھر شبستان چین کا چراغ بھی ٹمٹمانے لگا۔ اس سے آگے پانی کی اُس جانب نظر ڈالنا۔ ااہاہا! وہ تو ایک برج آتشیں اس سرزمین سے اُٹھا۔ دیکھنا! دیکھنا! آسمان کا تارا ہُوا جاتا ہے۔ کیا وہاں آتشبازی ہو رہی ہے؟ نہیں۔ نہیں۔ یہ سارے تہذیب کے پٹاخے ہیں۔ بھئی سچ پوچھو تو انکی شوخ رنگی کے آگے مغرب والوں کا رنگ پھیکا ہے! قبلہ! سب کچھ دیکھا۔ ساری دُنیا نئے نئے رنگوں میں چمکتی ہے۔ مگر نہ معلوم یہ کونسا تاریک خطہ ہے جہاں کہیں کہیں برق کی سی اُبھرتی روشنی نظروں میں کوندی جاتی ہے۔ بھئی۔ کیا پوچھتے ہو۔ یہ ہم غریب الدیاروں کا ٹوٹا پھوٹا وطن مالوف ہندوستان ہے وائے نصیب! کہ ہموطن ہیں۔ تو شب تاریک کے بجھے چراغ! جن پر آسمان تک چشمک زنی کر رہے ہیں۔ الٰہی! کب وہ دن ہوگا کہ شاہان سکندر حشمت اور پیر مردان خضر صفت کی زبان پر ہوگا۔ کہ ہاں آبحیات ہے تو ظلمات میں اور تہذیب ہے تو ہند میں۔ (آمین ثم آمین) ؎

"جاتا ہے وقت" ہے یہ جرس کی پکار آج
ہے کوئی کارواں میں اگر ہوشیار آج

الراقم
حنائی دست حسن و سُرمہ چشم جفا ہستم
بہر صورت کہ ہستم باعث زیب النساء ہستم
از لاہور
دہلی دروازہ

محفلِ ادب

شہاب کی سرگزشت

جس وقت آخری مرتبہ شہاب و اختر کے درمیان گفتگو ہوئی تھی، اسکو دو ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے اور اس زمانہ میں بارہا اختر کا جی چاہا کہ وہ شہاب کو دور ہی سے ایک نگاہ دیکھ لے، لیکن اسکو جرأت نہ ہوئی، کیونکہ شہاب کی تلخ گفتگو کا ایک ایک لفظ اُسکے دل میں زہراب غم بن کر اتر گیا تھا، اور وہ کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اس خیال کو دل سے جدا کر دے، جس کے "محبت" ہونے کا یقین اسکے مستقبل کو تاریک بنا رہا تھا،

وہ "شہاب سے" الفت کرنے لگی تھی، اسکا یقین تو اسکو اُسی وقت ہو گیا تھا جب سب سے پہلی مرتبہ اُس نے شہاب کو ساحل اپالو پر اپنے متعلق گفتگو کرتے سُن کر، اپنی پیشانی کو عرق آلود محسوس کیا تھا، لیکن اب تو اس کا علم طفیل اور اسکے احباب کو بھی ہو گیا تھا، اور اسٹیج کے بعض افراد بھی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے،

اس میں شک نہیں کہ اختر، بے انتہا خوددار و غیور عورت تھی اور جب وہ اپنی مضطرب خلوتوں میں شہاب کی بے پروائیوں کا تجزیہ کرنے بیٹھتی تو اپنے بدن کا ایک ایک ریشہ، فتیلہ کی طرح جلتا ہوا محسوس کرتی اور شہاب کی فطرت میں ہزاروں نقص نکال کر اس سے متنفر ہو جانا چاہتی تھی، لیکن اس خیال کے ساتھ ہی اسکا دل دھڑکنے لگتا۔ آنکھیں پُرنم ہو جاتیں اور آخر میں وہ شہاب کی بے اعتنائیوں کے سامنے اسی طرح سربسجود ہو جاتی، جیسے کوئی پجاری اپنے ظالم دیوتا کے سامنے جُھک جائے۔

اس مرتبہ اس نے کامل دو ماہ تک ضبط کیا، اس نے اس زمانہ کا ایک ایک لمحہ اس کوشش میں صرف کر دیا کہ کسی طرح شہاب کی تصویر کو اپنے دل سے محو کر دے، لیکن جب وہ اس میں کامیاب نہ ہوئی، تو اس نے آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ "اب جبکہ مجھے اس تباہی سے مفر نہیں، تو پھر کیوں نہ عہد انتظار کو جلد ختم کر دوں اور کیوں نہ اُس لمحہ سے قریب تر ہو جاؤں، جس سے دوچار ہونا مقسوم ہو چکا ہے"،

بمبئی کی بھیگی ہوئی رات کا ایک حصہ گزر چکا ہے۔ حیات معاشقہ کی سرگوشیاں کرنے والوں پر ہلکی چاندنی نے چلمن ڈالدی ہے اور گیس کی ملگجی روشنی ایک سوگوار حسن کی طرح، عالم سکوت میں اپنی زندگی

آہستہ آہستہ ختم کر رہی ہے، شہاب اپنے کمرہ میں بیٹھا ہُوا کچھ لکھ رہا ہے اور کبھی کبھی دریچہ سے اس منظر پر بھی نگاہ ڈال لیتا ہے۔

"کون سمجھ سکتا ہے، لیکن کم از کم آہنی تختیوں پر کندہ کرا کے کسی کھنڈر میں دفن تو کرا سکتا ہوں، ممکن ہے کہ مستقبل بعید میں جب انسان کا دماغ زیادہ تربیت یافتہ ہو جائیگا اور اسکو یہ "منقوشات" نظر آئینگے، تو وہ اس زمانہ کی تاریکی پر کوئی قطعی حکم نہ لگا سکیگا ——" شہاب یہ سوچتا جاتا تھا اور اپنی اُس تصنیف کو پورا کرتا جاتا تھا جسکا نام اس نے "الہامات" رکھا تھا —— جس وقت وہ اس فقرہ پر پہنچا کہ "دُنیا جن چیزوں کو محسوسات سے تعبیر کرتی ہے وہ حقیقتاً حِس کی رسوائیاں ہیں" تو بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑا ہُوا آنکھیں گرم ہو گئیں اور ہلکی سی لرزش اسکے جسم پر طاری ہو گئی —— تھوڑی دیر تک وہ کمرہ میں ٹہلتا رہا اور پھر دریچہ کے سامنے آکر کھڑا ہُوا تھا کہ کوئی شخص نیچے سے یہ شعر گاتا ہُوا گزرا۔

ترے جواہر طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

"کس قدر مرتفع سطح پر پہنچکر غالب نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ عام شعراء کے کلام سے یہ ایسا ہی ممتاز ہے جیسے رات کو آسمان کی بلندی میں چکور کی آواز زمین کے دوسرے طیور کی نغمہ سرائی سے —— "جواہر طرفِ کلہ" محسوس چیز ہے، لیکن اس پر "اعتمادِ نظر" حس کی رسوائی ہے "اوجِ طالعِ لعل و گہر" غیر محسوس ہے، لیکن "ذہنیات" کی زندگی اسی سے وابستہ ہے —— "حقیقتیں" جنکو ظاہر ہو جانا چاہیئے "مستور" ہیں اور "ظواہر" جو نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں انسان کے دل و دماغ پر مستولی نظر آتے ہیں —— یہ ساحل تلابہ پر چاندنی اور سمندر کی موجوں سے لطف اُٹھانے والے یہ دولت کی مستی و سرشاری میں اقتضائے فطرت کو محو کر دینے والے یہ "بدعاتِ تمدن" کیلئے "داعیاتِ روح" کو ایک انسانی آغوش کی گرمی میں سرد کر دینے والے، کس قدر بے خبر ہیں کہ وہ "اوہام" کیلئے کس طرح "حقائق" کی قربانی کر رہے ہیں اور ایک "آنی لذت" کیلئے "ابدی راحت" کو ہاتھ سے دیدینے میں کس قدر جری ہیں ——"

شہاب اسی خیال میں منہمک تھا کہ کسی آدمی نے زینہ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک خط دیکر چلا گیا۔۔۔۔۔۔

"شہاب صاحب آپ سے ملے ہُوئے ایک زمانہ گزر گیا لیکن یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا بلکہ اس میں میرا مقصد و ارادہ شامل تھا میں چاہتی تھی کہ آپ سے نہ ملوں اور آپ سے ملنے کا خیال بھی دل سے محو کر دوں لیکن اس دو مہینے کے عرصہ میں میری کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہُوا کہ آج میں اپنی ہستی کو آپ کے سامنے مغلوب دیکھتی ہوں اور میں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ محبت جو ظلم کی طرف سے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اسکا مٹانا ناممکن نہیں لیکن پھر بھی آپ سے اسکی توقع کرتی ہوں۔ دل میں ابھی نئی آگ لگی ہے اور اضطراب اس قدر بھی سمجھنے کا موقع نہیں دیتا کہ آگ لگانے

والے بجھاتے نہیں۔

بہرحال میرے اعترافِ شکست کو قبول کیجئے۔ اور کم از کم مجھے یہ تو محسوس نہ ہونے دیجئے کہ آپ مجھ سے برہم ہیں کہ آپ کا یہی لطف میرے لئے بڑی لذتِ روح ہے۔ "اختر"

شہاب نے یہ خط پڑھا اور اس کی پشت پر صرف یہ لکھ کر

"برو ایں دام بر مرغ دگر نہ ... کہ عنقا را بلند است آشیانہ"

ایک لفافہ میں بند کیا اور آدمی کو دیا کہ اسی وقت لیٹر بکس میں ڈالدے۔

بمبئی کی دوپہر اپنے کاروباری ہنگامہ کے لحاظ سے اک خاص دلچسپی رکھتی ہے، اور خصوصیت کے ساتھ فورٹ کا حصہ تو نہایت دلچسپ نمائش گاہ نظر آتا ہے، آراستہ و مہذب دوکانوں کا آئین آرائش و اعلان موٹروں اور خوبصورت فٹنوں کا سامنے اپنی قاعدہ قطار سے اُنکی زینت میں اور اضافہ کرنا، مختلف رنگ کی ساریوں میں حسن و شباب کا، قوس و قزح کی پریوں کی طرح دوکانوں کی فضا میں اپنے سبک و شوخ قدموں سے تلاطم رنگ و نور پیدا کرتے رہنا۔ یہ وہ معمولی مناظر ہیں جو روز اک نئی شان سے نظر آتے رہتے ہیں۔

...... بکسیلر (کتب فروش) کی دوکان بھی اسی نوع کی آبادی سے معمور ہے، اور عین اس وقت جبکہ اختر بھی کسی کتاب کی تلاش میں مالک دوکان کی میز کے پاس کسی الماری کو دیکھ رہی ہے، وہ ایک کلرک کو ہدایت کرتا ہے کہ "مسٹر شہاب کی کتاب واپس کرکے اطلاع دیجائے۔ کہ ہم اس وقت اسکی اشاعت سے مجبور ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا جائے کہ ان کا حساب عرصہ سے معلق حالت میں پڑا ہُوا ہے، اور ہم اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔

مسٹر شہاب! کتاب کی واپسی!! حساب کا معلق حالت میں پڑا رہنا!!! اختر کے لئے یہ وہ انکشافات تھے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ مبہوت ہوگئی اور اُس نے یقین نہیں کیا کہ یہ گفتگو اسی کے شہاب کے متعلق تھی، اب اس نے الماری میں کتاب کی تلاش کو ختم کردیا اور آہستہ آہستہ مالک کی میز کے پاس آکر دریافت کیا۔ "کیا براہ کرم آپ مجھے مطلع فرما سکتے ہیں کہ ابھی آپ نے جس کتاب کی واپسی کے متعلق حکم دیا ہے وہ کس کی ہے اور اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے دکھائیے کہ وہ کس موضوع پر لکھی گئی ہے"

اس نے یہ سُن کر پہلے کچھ حیرت آمیز تامل کیا، لیکن پھر اس خیال سے کہ ایک خاتون کی درخواست

کا مسترد کرنا آئین تہذیب کے خلاف ہے، اس نے جواب دیا کہ " وہ کتاب مسٹر شہاب کی ہے جو کچھ عرصہ سے بمبئی میں مقیم ہیں، اور علیگڈھ کالج کے نہایت ذہین و قابل گریجویٹ ہیں میں ان سے کئی بار ملا ہوں، اور اس میں شک نہیں کہ انکی گفتگو حیرت انگیز طور پر دلچسپ ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کا دماغ صحیح نہیں ہے اور جو کتاب انہوں نے بغرض اشاعت میرے پاس بھیجی ہے وہ غالباً اسی وقت کی دماغی حالت کا نتیجہ ہے جب وہ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے اسکا نام انہوں نے " الہامات " رکھا ہے۔ اور جس میں نوامیس فطرت پر فلسفیانہ انداز سے بحث کی ہے، لیکن وہ بحث اس قدر دقیق ہے کہ لوگ اسکو سمجھ نہیں سکتے، اور آپ جان سکتی ہیں کہ ایسی کتاب کی اشاعت سے ہمیں کیا فایدہ حاصل ہوسکتا ہے۔

کیا آپ وہ کتاب دیکھنا چاہتی ہیں؟ ۔ اختر " جی ہاں، اگر کوئی حرج نہ ہو "

اس نے اپنا چپراسی بھیجکر وہ کتاب منگوائی اور اختر کو دیکر پھر اپنے کام میں لگ گیا —— اختر نے سب سے پہلے اس کے سرورق کو دیکھا جس پر سُرخ حرفوں میں " Revelations " (الہامات) درج تھا اور اسکے نیچے " By Shehab " (از شہاب) لکھا ہُوا تھا۔ وہ شاید ابھی یقین نہ کرتی کہ یہ وہی شہاب ہے لیکن جب اس نے دوسرے صفحہ پر اس مفہوم کی عبارت تہدیہ دیکھی:-

میں عنوان بناتا ہوں

اس مجموعہ کا

اُس ستارہ صباحی کو جو سحر رات میرے ساتھ اس دُنیا پر اک مایوس نگاہ ڈالتا ہُوا، دامن افق میں اپنا چہرہ چھپالیتا ہے۔

"شہاب"

تو وہ سمجھ گئی کہ دنیا میں صرف ایک ہی شہاب یہ لکھ سکتا ہے اور اس لئے اس نے مالک دکان سے کہا کہ :- " کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ مسٹر شہاب نے اس کا حق تصنیف کس قدر طلب کیا ہے "

مالک :- " ایک ہزار روپیہ "

اختر :- " کیا ممکن نہیں کہ کوئی دوسرا شخص یہ رقم ادا کرکے اس کتاب کو خرید لے اور آپ اپنی طرف سے وہ رقم مسٹر شہاب کو پیش کردیں؟ "

مالک :- " لیکن پھر سوال اشاعت کا رہ جاتا ہے، کیونکہ غالباً وہ اسکو منظور نہ کرینگے کہ اس کی

اشاعت میں تعویق ہو"

اختر:" اس کی اشاعت کے مصارف کا اندازہ آپ نے کس قدر کیا ہے؟"

مالک:" دو ہزار"

اختر:" اور مسٹر شہاب کے ذمہ آپ کا کس قدر مطالبہ ہے؟"

مالک:" تین سو روپیہ"

اختر:" میں ممنون ہوں گی اگر آپ مسٹر شہاب سے دریافت کرکے مجھے اطلاع دینگے کہ وہ اس کتاب کی اشاعت کا زیادہ سے زیادہ کب تک انتظار کر سکتے ہیں اور اپنے کلرک کو منع کر دینگے کہ آج انہیں وہ تحریر نہ بھیجے جس کے بھیجنے کا آپ نے حکم دیا ہے"

مالک دوکان نے جو اختر کے ہر سوال پر سراپا استفہام و استعجاب ہوجاتا تھا، اسکو کچھ تامل کے ساتھ منظور کرلیا اور اختر اس کا شکریہ ادا کرکے چلی گئی + (نگار)

دولت

دولت اچھی چیز ہے مگر ایمان اس سے بدرجہا بہتر ہے، خدا کی دی ہوئی نعمتیں بیش بہا ہیں اور اسی لئے انکو ہم قیمت سے نہیں خرید سکتے، سورج، چاند، ستارے، اور فطرت کے سارے مناظر خدا نے ہمیں مفت عنایت کئے ہیں۔ دولت کے لئے ایمان کو چھوڑ دینا عقلمندی نہیں -

دولت سے ہم خوراک خرید کر سکتے ہیں نہ کہ بھوک

" " " نرم بچھونے " " " نیند

" " " عینک " " " نظر

" " " ہمنشیں " " " دوست

" " " مقوی غذا " " " قوت

" " " کتابیں " " " علم

" " " نفسانی خوشی " " " روحانی

" " " سکون ظاہری " " " شانتی

دولت سے ہم نوکر خرید کر سکتے ہیں نہ کہ	دلی خدمت
" " " زیورات " " "	خوبصورتی
" " " خوشامد " " "	محبت
" " " مذہبی کام " " "	ایمان

(زمانہ)

تنہائی

(از ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے)

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موجِ بیتابے، "ہمیشہ در طلب استی، چہ مشکلے داری؟

ہزار لؤلؤئے لالاست در گریبانت، درونِ سینہ چو من گوہرِ دلے داری؟"

تپید، و از لبِ ساحل رمید، و ہیچ نگفت۔

بہ کوہ رفتم و پرسیدم "ایں چہ بیدردیست؟ رسد بہ گوشِ تو آہ و فغانِ غم زدۂ؟

اگر بہ سنگِ تو لعلے ز قطرۂ خون است۔ یکے درآ بہ سخن با منِ ستم زدۂ؟"

بخود خزید، و نفس در کشید، ہیچ نگفت

رہِ دراز بریدم، ز ماہ پرسیدم، "سفر نصیب! نصیبِ تو منزلے ست کہ نیست؟

جہاں ز پرتوِ سیمائے تو سمن زارے، فروغِ داغِ تو از جلوۂ دلے ست کہ نیست؟"

سوئے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نہ گفت

شدم بحضرتِ یزداں۔ گذشتم از مہ و مہر کہ "در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست

جہاں تہی ز دل، و مشتِ خاکِ من ہمہ دل، چمن خوش است، ولے درخورِ نوایم نیست"

تبسمے بہ لبِ او رسید، و ہیچ نہ گفت

(صوفی)

نئی کتابیں

رفیق زندگی (اڈلٹ ریڈر) دیہات کے عمر رسیدہ لوگوں کی تعلیم کے لئے یہ ریڈر جناب شیخ نور الٰہی صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس انسپکٹر سکولز ملتان ڈویژن نے تصنیف فرمائی ہے۔ کسان لوگ تعلیم نہ ہونیکی وجہ سے جن توہمات و مصائب کا شکار ہوتے رہتے ہیں مثلاً نت نئی خانہ جنگیاں، ذرا ذرا سی بات پر باہمی مقدمات، شادی بیاہ پر سودی روپیہ حاصل کرکے دھوم دھام، طاعون، چیچک، اور قسم قسم کی بیماریوں میں صحیح ڈاکٹری علاج کی بجائے بھوت پریت جن پری کے توہمات کی بناء پر سیانوں اور ملیوں سے رجوع یہ اور دوسری قسم کی بدرسموں کی اصلاح پُر لطف مکالموں اور دلچسپ کہانیوں کے ذریعہ ایسی خوش اسلوبی سے ذہن نشین کی گئی ہے کہ اسے پڑھ کر کسان لوگ تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ اپنی کسانو زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق معلومات کی روشنی حاصل کر سکینگے۔ مصنف کی سلاستِ زبان اور خوبیٔ بیان کا اندازہ وہاں ہوتا ہے جہاں وہ جدید سائنٹیفک اصول کے مطابق زراعت کے طریقے کھاد کی مختلف قسموں کی تفصیل اور فصل کی مختلف حالتوں میں اسکے استعمال کی مختلف ترکیبیں سمجھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ساہوکاروں سے سود در سود روپیہ حاصل کرنے کے تباہ کن نتائج سبق آموز کہانیوں کے ذریعہ سمجھا کر زمیندارہ بنک کے قیام کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے، دیہات میں نائٹ اسکولوں کے بے اندازہ فائدوں کی تفصیل کے ساتھ جبریہ تعلیم کے فوائد بتائے ہیں۔ پھر ان تمام امور ضروریہ کی تعلیم اور اس کی خوبیاں کمشنر ڈپٹی کمشنر یا تحصیلداروں کی زبان سے بیان نہیں کی گئیں بلکہ زمینداروں کی فطرت کا گہرا مطالعہ کرکے ذیلداروں، نمبرداروں اور کسانوں کے سادہ مکالموں کے ذریعہ جتائی گئی ہیں۔ یہ ریڈر لکھی تو گئی ہے سن رسیدہ گنواروں کے لئے لیکن حسن بیان کی بدولت افسانے کی طرح دلچسپ ہے۔

تباہ حال زمینداروں کے لئے یہ ریڈر لکھ کر درحقیقت مصنف نے انسانیت کی ایک خدمت انجام دی ہے۔

حجم ۷۵ اصفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ تعلیمی کتابوں کی طرح ہے۔
دار الاشاعت پنجاب سے مل سکیگی۔

مکاتیب۔ یہ نواب محسن الملک بہادر اور نواب وقار الملک بہادر کے خطوط کا مجموعہ ہے اور باقیات الصالحات میں خاص اہمیت رکھتا ہے، خطوط زیادہ تر دار العلوم علیگڈھ کے وقتی مباحث سے لبریز ہیں، جن سے تاریخی شان ٹپکتی ہے۔ جناب منشی محمد امین صاحب زبیری نے اس کی اشاعت سے قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ مجموعہ میں دونوں بزرگوں کی تصویریں اور دستی تحریروں کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ کتاب بجا طور سے محترم بزرگ مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر (اٹاوہ) کے نام نامی سے منسوب ہے۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ کتابت و طباعت خاصی۔ قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد امین صاحب زبیری ریاست بھوپال

حور۔ یہ نسوانی ادب کا ماہانہ صحیفہ بیگم صاحبہ صدیق انصاری کی زیر ادارت کلکتہ سے نکلا ہے جسے مضامین کی پاکیزگی و لطافت اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے اسم بامسمیٰ کہنا پڑتا ہے۔ زیر نظر نمبر میں "نند بھاوج کے نامہ و پیام" بے نظیر نظم ہے۔ یہ رسالہ دُنیائے نسواں کے لئے خاص دلچسپیاں فراہم کرتا ہے اور ہم توقع کرتے ہیں کہ سنجیدہ اور لطیف ادب کی مطالعہ کرنے والی نسوانی نگاہیں اس پیاری سہیلی کو نہایت پسند کرینگی۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت صرف سے ر جو بہت کم ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ مینجر رسالہ حور نمبر ۲۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ۔

الصالح۔ تصوف و اخلاق کا یہ ماہانہ رسالہ غلام احمد خاں تریاں کی ادارت میں دار السلطنت دہلی سے نکلا ہے، قومی اور مذہبی مضامین سے بھی خالی نہیں ہوتا، حجم ۳۶ صفحات قیمت مع محصولڈاک صہ ر دفتر الصالح دہلی سے طلب کیجئے۔

سفیر التجار۔ یہ تجارتی رسالہ بھی دہلی سے نکلتا ہے جس کا واحد مقصد تجارتی اسباب کی خرید و فروخت اور صنعت و دستکاری کی تمام چیزوں کو فراہم کرنا قرار دیا گیا ہے، اردو میں ابتک کوئی تجارتی رسالہ اس شان سے نہیں نکلا، ہمیں اُمید ہے کہ یہ ترقی کریگا اور تجارتی حلقہ میں اس کی دن دونی اور رات چوگنی اشاعت ہوگی۔ رسالہ کاغذ اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی بینظیر ہے صفحات ۳۶۔ قیمت سالانہ للعہ ر مینجر رسالہ سفیر التجار۔ فیض بازار۔ پھول منڈی۔ دہلی +

شگوفہ۔ یہ نظم و نثر کا گلدستہ کانپور سے جناب روحی کی ادارت میں نکلا ہے مضامین کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ کسی خاص مقصد کا حامل ہے البتہ روس کے مشہور فلسفی ٹالسٹائی

کے انسانہ، رازحیات، کا ترجمہ کام کی چیز ہے۔ حجم ۲۴ صفحات قیمت سالانہ عہ
ملنے کا پتہ۔ ڈائرکٹر صاحب رسالہ شگوفہ پیچ باغ کانپور۔

مظاہر جدید۔ سائنس اور صنعت وحرفت کا یہ ماہانہ رسالہ ڈیرہ دون سے نکلتا ہے اردو میں سائنٹفک رسالوں کا کال ہے خوشی کی بات ہے کہ اس طرف توجہ ہونے لگی ہے۔ اہل سائنس کو اسکی قدر کرنا چاہیئے حجم ۴۰ صفحات قیمت قسم اول ہے، قسم دوم علہ ملنے کا پتہ:۔ آغا عبدالرسول قادری تکول (علیگ) مینیجر و اڈیٹر رسالہ مظاہر جدید ڈیرہ دون +

الفیض۔ یہ ۲۴ صفحے کا ماہانہ رسالہ امرتسر سے نکلتا ہے، مسلمانوں کی مذہبی حالت کو ہر پہلو سے بہتر بنانا اسکے مقاصد اولین ہیں ہے۔ مذہبیات کے دلدادے ضرور نمونہ منگا کر ملاحظہ فرمائیں قیمت سالانہ سعہ نمونہ ۲ر مینیجر رسالہ الفیض۔ چوک فرید۔ امرتسر سے طلب کیجئے +

رفیق التعلیم۔ یہ تعلیمی رسالہ رائیصاحب لالہ رگھوناتھ سہائے صاحب بی۔ اے۔ اور پنڈت دتستہ پرشاد صاحب بی۔ اے۔ کی ادارت اور سررشتہ تعلیم پنجاب کی سرپرستی میں لاہور سے نکلتا ہے، پنجاب کی تعلیمی حالت کو سنوارنا اور یونیورسٹی کے اہم مباحث پر بحث کرنا اسکے ضروری مقاصد ہیں۔ اور اس نظر سے وہ شاندار خدمات انجام دے رہا ہے۔ ضخامت ۴۰ صفحات قیمت سالانہ ہے ر

درپن۔ یہ ماہوار سیاسی۔ اقتصادی، اور تاریخی رسالہ جناب موہن لعل صاحب بھٹناگر بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل ہائیکورٹ لاہور کی زیرادارت لاہور سے نکلتا ہے۔ سلیس اردو میں ظرافت کی چاشنی کے ساتھ اہم مسائل کو ادا کرنا اور انکی تنقید و تصریح صرف اس کا کام ہے۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت سالانہ للعہ ر مینیجر رسالہ درپن۔ درپن ہاؤس۔ لاہور سے طلب کیجئے۔

قادری نوشاہی۔ مذہب اور تصوف کا یہ ماہوار صحیفہ قدوۃ السالکین اعلیحضرت محمد فتح علی خاں قلندر نوری قادری نوشاہی کی سرپرستی اور چودھری سلطان علی کی ادارت میں لاہور سے نکلتا ہے حجم ۴۰ صفحات چندہ سالانہ ہے ر ملنے کا پتہ:۔ مینیجر رسالہ قادری نوشاہی لاہور +

فہرست مضامین بابت ماہ جون ۱۹۲۴ء

جہاں نُما

دُنیا میں ہم اس لئے آتے ہیں کہ دُنیا کو جان کر زندگی کو سمجھیں۔ آنکھوں سے دیکھیں کانوں سے سُنیں ناک سے سونگھیں مُنہ سے چکھیں اعضائے سے محسوس کریں اور عقل سے سمجھیں کہ یہ سب کچھ جسے ہم دیکھتے اور سُنتے سونگھتے اور چکھتے اور محسوس کرتے ہیں کیا ہے؟ دُنیا نام ہے رنگ رنگ کی کیفیتوں کا وحدت میں کثرت ہے اور پھر ہر شئے کی خاصیّت اور خصوصیّت جُدا جُدا ہے۔ یہاں ہم جتنی بھی مختلف چیزوں کو جانیں اُتنا ہی ہم بہتر جانتے ہیں کسی ایک شئے کو البتہ محض جاننے کی چاٹ لگ جائے اور حقیقی وجدان نہ ہو تو سو چیزوں کے جاننے سے ایک دو کا جان لینا ہی بہتر ہے۔ ہم میں سے ہر ایک دُنیا بھر کو جان لینے کا خواہشمند ہے لیکن دیکھئے تو کتنے ہیں جو اپنے تئیں بھی جاننے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اک دُنیا ہمارے قدموں میں ہے ہمارے اردگرد ہی آباد ہے لیکن ہم نئی نئی ولایتوں کی سیر کرتے ہیں کہ کہہ سکیں اور خیال کرسکیں کہ ہم نے سیر کی۔ سیر تو اپنے دل ہی میں ہے لیکن اس سیر سے لُطف اُٹھا سکنے والے کتنے ہیں اسے سمجھتے بھی تو بہت کم ہیں۔

مُدیرِ ہمایوں کو بھی یہ خبط سمایا کہ تھوڑی سی دُنیا کی سیر کیجئے۔ گھر سے چل نکلئے خوشی کی تلاش میں صحت کی جستجو میں۔ کتنی غلط فہمی میں مبتلا ہونا ہے کس قدر کوتاہ اندیشی ہے کہ جو چیزیں پاس ہوں اُنکو ڈھونڈھنے کے لئے دور دراز کا سفر کیا جائے۔ لیکن انسانی فطرت ایسی ہی ہے جب اپنی زیاں کاری کے باعث سعیٔ و ریاضت کا حق ادا نہیں کرنا چاہتی تو قدرت کو جھٹلانے اور اپنے آپ کو سچا سمجھنے کے لئے نئے نئے طریق اختراع کرتی ہے۔ غنیمت ہے اگر عمر بھر ان غلط کاریوں میں مبتلا نہ رہے۔ ہمیں اتنی تسلی بس ہے کہ اَور بھی کروڑوں یہی کچھ کرتے ہیں۔

فلسفے کو پسِ پشت ڈال کر آنکھیں دیکھتی ہیں تو بحیرۂ عرب کا نظارہ پیشِ نظر ہے۔ یہیں دس برس ہُوئے یہ سب کچھ دیکھا تھا اور کانوں نے بہت کچھ اَور بھی سُنا تھا جو وہ اب نہیں سُنتے۔ سُنتے تھے کہ جرمن ہمارے جہاز کے تعاقب میں ہیں جرمنوں کا زور تھا دُنیا بھر اُنکے نام سے کانپتی تھی خود اُن کا غرور آسمان پر پرواز کرتا تھا انسانیت کو پتہ نہ تھا کیا ہونے والا ہے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ قوت کے غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے کبھی اس غرور کی شکست برسوں میں ہوتی ہے کبھی صدیوں میں لیکن جب بھی ہو ہوتی شکست ہی ہے۔ جرمن بازی ہار چکے لیکن مغرور لوگ اب بھی اکڑ اکڑ کر پھرتے ہیں افسوس کہ یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ کتنی اُمتوں کو خالق نے ہلاک

کردیا تاکہ اُنکی رُوح کو زندہ رکھے۔ عبرت ہونی چاہیئے مگر ہوتی کبھی نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ دُنیا تجربوں کا مقام ہے عبرتوں کی جگہ نہیں۔ عبرت کی تکمیل تجربے میں جاکر ہوتی ہے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں دوسرے کی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہی زندگی ہے!

جہاز پر ایک افغان سے ملاقات ہُوئی جو شکل و گفتگو سے ایک انگریز معلوم ہوتا تھا۔ کہا کہ میں افغان ہوں چالیس برس آسٹریلیا میں رہا وہیں اک انگریز خاتون سے شادی کرلی بال بچّوں کو وہیں پالا پڑھایا۔ امیر امان اللہ خاں کی تعریف سُن کر جی میں سمائی کہ اپنے وطن کا رُخ کرنا چاہیئے۔ وہاں پہنچا اور ایک انگریز دوست ہمراہ تھا امیر تک رسائی ہُوئی تو اُسے حد درجہ بیدار مغز اور دُوربین پایا۔ کہاں پہلے حکمرانوں کے عیش و عشرت کے سامان کہاں اس خدا ترس رہبرِ قوم کی حق پرستی؟ مختلف قوموں کے "مہذب لوگوں" کو بلایا ہے کہ ملک کے ہر شعبے میں اک نئی رُوح ڈالیں سینکڑوں نوجوانوں کو مغربی ملکوں میں تعلیم کی غرض سے بھیجا ہے کہ واپس آکر اپنے وطن کو علم کے نور سے روشن کریں۔ خلافت کا ذکر ہُوا تو کہا کہ افغانستان کو اس سے کُچھ تعلق نہیں وہ اس قسم کے جھگڑوں سے پاک ہے اور پاک ہی رہنا چاہتا ہے جن کو اُس کے متعلق تشویش ہے وہ کیا کریں۔ ہمیں اس سے کیا غرض؟ دَوران گفتگو میں کہا کہ جہاں وطن کا معاملہ درپیش ہو وطن پہلے اور بیوی بچے پیچھے کہ غیرتِ قومی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ معلوم ہُوا کہ یہ صاحب اس غرض سے اِنگلستان جارہے ہیں کہ سونے اور جواہرات کی کانوں کے متعلق واپس آکر افغانستان میں کام شروع کریں۔

بحیرۂ عرب ہے اور بار بار یہی خیال آتا ہے کہ کیا اچھا ہو اگر عرب کے موجودہ حکمران بھی یونہی ترقی کی شاہ راہ پر اپنے مُلک کو لگائیں اور کم ظرفی کے خیالات کو اپنے سینے میں جگہ نہ دیں۔ اسلام کا بول بالا مسئلہ خلافت کا حل اِسی میں ہے کہ ہر مُسلمان قوم اپنے اپنے مُلک میں ترقی کرے غیر مسلم قوموں کی خوبیاں اپنے میں پیدا کرے پھر کون ہے جو اُن کی آزادی کو حرمت کی نگاہ سے نہ دیکھے گا۔

دب

مولوی سیّد احمدؐ دہلوی

مولوی محمد حسین آزاد اگر آج زندہ ہوتے تو وہ ادب اردو کا دور آخر لکھتے اور اُن کا غم دوز قلم دُنیائے ادب و شعر کی تباہیوں کا خاکہ کھینچتا۔ دہلی کا قدیم تمدن، پُرانی تہذیب اب کہاں۔ علمی چرچے مٹ گئے، پڑھے لکھے لوگ ایک ایک کر کے اُٹھ چکے اور اس دیار غریب میں کوئی بہار باقی نہ تھی مگر پھر بھی مولوی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمدؐ کے دم سے دہلی کا علمی چراغ روشن تھا۔ مفلس کے جیب میں چند سکے تھے وہ خرچ کرنے وہ بھی لے لئے۔ اب اسکے پاس کیا رہا لے دے کے مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ غنیمت تھے، شبنم کے قطرے خاروں کی پیاس کہاں تک بجھاتے تاہم کچھ زیست کا سہارا تھا، حیف وہ بھی نہ رہے، اب دلی اور دلی کے مشاہیر کا فسانہ کیا، اُجڑا دیار بے نور بے رونق پڑا ہے!

کسی وقت میں اگر ادب اردو کا کوئی جدید تذکرہ لکھا گیا تو لاریب مؤلف فرہنگ آصفیہ کا بھی اُردو کے محسنوں میں شمار ہوگا مرحوم نے فرہنگ آصفیہ نام نہایت بسیط ضخیم اور جامع لغت اُردو کا لکھ کر زبان پر غیر معمولی احسان کیا ہے ان سے پہلے اس نوع کی لغت نگاری کے اسلوب پر کسی کو توجہ نہ تھی اور اب کام کرنے والوں کو یہ راہ صاف معلوم ہوتی ہے

آج ہم مؤلف فرہنگ آصفیہ مرحوم کے مختصر حال لکھنے بیٹھے ہیں، آپ اُس کوفت اور دقت کا اندازہ نہیں فرما سکتے جو معمولی سے معمولی حالات کی فراہمی میں نصیب ہوئی ہے حالانکہ ابھی چند ہی سال مرحوم کے انتقال کو ہوئے ہیں۔

گفتگو اس سے نہیں کہ انکی تصنیف و تالیف کے نام کیا ہیں۔ اُن کا انداز تحریر کیا تھا۔ اُنکے افکار علمی کا موضوع کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ ہے انکے مشاغل علمی اور اُس میں غلو، اُن کا رجحانِ طبعت اور ذوق پھر عام دلچسپیوں کی تفصیل و اندازہ جس سے معلوم ہو سکے وہ بنانیوالا کون ہے!

بہرحال اس جملہ معترضہ کے بعد ہم کچھ حالات مرحوم کے لکھتے ہیں:۔

مولوی سید احمد مرحوم محرم الحرام کی نویں تاریخ سنہ ۱۲۶۲ھ مطابق ۸ جنوری سنہ ۱۸۴۶ء کو بلاقی بیگم کے کوچہ میں پیدا ہوئے اور شاہ صابر بخش کے باغ واقع فیض بازار میں ہوش سنبھالا۔ مرحوم مولوی حافظ سید عبد الرحمن مرحوم خلف مولوی سید خواجہ علی صاحب مغفور کے بیٹے تھے آپ کے آباؤ اجداد سادات و علمائے بخارا سے حسنی و حسینی سید اور حضرت غوث اعظم کی اولاد امجاد سے تھے۔

مولوی صاحب مرحوم نے درسی کتابیں بڑے بڑے اساتذہ سے گھر پر اور سررشتہ تعلیم کی کتابیں سرکاری

مدارس اور نارمل اسکول دہلی میں پڑھیں تصنیف و تالیف کا ملکہ قدرت سے ملا تھا چنانچہ بچپن ہی سے اسکے آثار پیدا تھے۔ بالخصوص اردو زبان کی تدوین پر دل و جان سے فریفتہ و شیفتہ تھے اردو زبان کے شعرائے ماضی و حال کے کلام کا مطالعہ بہت توجہ نہایت عمیق نظر سے مدتوں کیا اور شہزادگانِ دہلی اور نامی گرامی شعراء کی صحبتوں میں بیٹھ کر اپنے مخفی جوہر دن کی جلا اور اپنے ذوق کی پرورش کی۔

ایام طالب علمی میں اک فارسی منظوم طفلی نامہ اور ایک انشائے تقویت الصبیان بقید تلازمہ اردو میں تصنیف کی تھی انشاء اُسی زمانہ میں دہلی میں شائع ہوئی پھر ۱۸۶۹ء میں اک مختصر رسالہ مناظرہ تقدیر و تدبیر پر کنز الفوائد نام تصنیف کیا اور گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کے حضور پیش کیا اُس پر گورنمنٹ کی جانب سے دو سو روپیہ کا انعام ملا اور اول مرتبہ سرکاری خرچ سے یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی!

یہ تمام سلسلۂ تصنیف و تالیف شعر گوئی کی آورد تھی اور آمد کا پیش خیمہ۔ مرحوم کو اپنے زمانہ تعلیم سے یہ دھن لگی ہوئی تھی کہ اردو کا کوئی مکمل لغات مدون ہو جائے، چنانچہ ۱۸۶۸ء میں اللہ پاک پر بھروسہ کرکے اُنھوں نے یہ کام شروع کر دیا تھا کنز الفوائد کے انعام نے مصنف کی ہمت اور بڑھا دی اور بہت ذوق و شوق سے یہ ترتیب و جمع لغت کے کام میں مصروف و مشغول ہو گئے۔

۱۸۷۰ء میں ایک کتاب وقائع درائنیہ اردو میں تالیف کی گورنمنٹ نے قدردانی سے ڈیڑھ سو روپیہ انعام دیا اس سے مزید تقویت و سہولت اصلِ کار کو نصیب ہوئی۔ چنانچہ چھ سال کی مسلسل سعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لغات اردو کا بہت سا حصہ مسودات کی شکل میں تیار ہو گیا اور ابتدائی مسودہ کی درستی شروع ہو گئی۔

اُس زمانہ میں ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو فیلن صاحب انسپکٹر مدارس صوبہ بہار ایک ہندوستانی انگلش ڈکشنری کی ترتیب میں مشغول تھے اور ان کو دہلی کے ایک ایسے اسکولر (ماہر زبان) کی ضرورت تھی جو صاحب موصوف کی ڈکشنری کے کام میں انکو مدد دے۔ مولوی صاحب موصوف کا تذکرہ سُن کر ڈاکٹر صاحب خود دہلی تشریف لائے۔ اور انگریزی میں ترجمہ کرنیکی خدمت کے لئے منشی فقیر چند کو اور اردو میں تیار کرنے کے واسطے مولوی صاحب ممدوح کو منتخب کیا اور اپنے ساتھ دانا پور لے گئے جہاں مولوی صاحب مرحوم کی گرانبہا امداد سے سات سال کے عرصہ میں انکی ڈکشنری مکمل ہوئی۔ اسکے بعد ۱۸۸۰ء میں مہاراجہ الور کے طلب پر انکے سفرنامہ کے لکھنے کے لئے الور چلے گئے تقریباً چھ ماہ میں سفرنامہ کے کام سے فارغ ہو کر تنخواہ اور بہت سے انعام و اکرام کے ساتھ گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کی نائب مترجمی کی خدمت پر لاہور بلائے گئے۔

ڈکشنری کی ترتیب کے زمانہ میں جو اُردو کتابیں مولانا مرحوم نے لکھیں یہ ہیں:۔
(۲)۔ تکمیل الکلام (۳) تحقیق الکلام (۴)۔ رس کہان (۵)۔ ریت بکھان (۶)۔ ناری کتھا (۷) قواعدِ اردو (۸)۔ لغات النساء (۹)۔ ساجن موہنی۔

جب مولوی صاحب لاہور گئے تو خیال کیا کہ اتنی بڑی کتاب چھاپنا میری مقدرت سے باہر ہے اور اتنی ضخیم کتاب کی خریداری ابناء وطن کے ذوقِ مطالعہ پر کس قدر گراں ہوگی تو اصل کتاب کا خلاصہ کرنا شروع کردیا اور ۱۸۸۲ء سے ماہوار رسالہ کی صورت میں نکالنے کا اہتمام کیا۔ لیکن افسوس یوں بھی کام نہ چلا۔ بالآخر سین مہملہ تک چالیس نمبر نکال کر آئندہ رحمت خداوندی کے امیدوار ہو کر بیٹھ رہے۔ لیکن شغلِ تصنیف و تالیف ترک نہیں کیا وہ اپنے مشاغل علمی میں مصروف تھے کہ انکی دعا کا تیر نشانہ پر لگا اور ۱۸۸۸ء میں سر آسمان جاہ بہادر مدارالمہام نظام ایک غیبی فرشتے کی شکل میں دکن سے شملہ میں تشریف لائے اور یہ اس زمانہ میں شملہ ہائی سکول کے ہیڈ مولوی تھے صرف اک عرضی کے وسیلے سے انکے حضور تک پہنچ گئے اور مسودہ پیش کیا۔ مطبوعہ رسالے اور دیگر کتابیں تحفتہً ان کے حضور گذرانیں اور حضور نظام کے نام نامی پر ڈیڈیکیٹ کرنے کی اجازت لی۔ اس پر سر دست پانچسو روپیہ کا انعام اور چار سو جلدوں کی خریداری منظور ہوئی اور ختم کتاب پر معقول انعام کا وعدہ ہُوا۔ پس اس وقت سے کتاب کے طبع کی بنیاد پڑگئی اور نام اس کا فرہنگ آصفیہ رکھا گیا۔ اس عظیم الشان کتاب کو اگر دیکھا جائے تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے زبان اردو پر غیر معمولی احسان کیا ہے اور جبتک زبان زندہ ہے اُن کے احسان کو فراموش نہیں کریگی۔

الغرض جس لغات کی ابتدا ۱۸۶۸ء میں ہوئی تھی وہ ۱۸۹۲ء میں ختم ہوئی اور ۱۹۰۱ء میں بہمہ وجوہ تکمیل کو پہنچ کر پورے تینتیس سال میں حضور نظام کی نظر تلطف سے یائے تحتانی تک شائع ہوگئی۔

جب یہ فرہنگ ختم ہوگئی اور شائع ہوئی تو حسب وعدہ پانچہزار روپیہ کا انعام مرحمت اور وظیفہ ماہواری منظور ہُوا۔

فرہنگ آصفیہ میں چون ہزار کے قریب لغات محاورات اور اصطلاحات ضرب الامثال وغیرہ ہیں گورنمنٹ پنجاب نے بھی ازراہ قدردانی ۱۹۰۱ء میں پانچسو روپیہ انعام اور ہزار روپیہ کی خریداری سے مصنف مرحوم کی حوصلہ افزائی کی۔

فرہنگ آصفیہ کی خصوصیات جو اُسے اُردو لغات کی تمام کتابوں پر فوقیت بخشتی ہیں یہ ہیں:۔

۱ - پہلی لغات نامکمل تھیں اور یہ ہر طرح مکمل ہے -
۲ - **الف** - پرانی لغت کی کتابوں میں صرف الفاظ کے معنے بیان کئے گئے ہیں اور اس میں صرف معنی بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ ہر لفظ کا تلفظ بھی بتایا ہے -
ب - استعمال کے مواقع بھی بیان کئے گئے ہیں -
ج - ہر لفظ کا مادہ اشتقاق و انصراف بھی بتایا ہے -
د - الفاظ کو تبدیل لہجہ شدت، اور خفت کے ساتھ پڑھنے سے معانی میں جو فرق ہو جاتا اسکی ہر جگہ تشریح کیگئی ہے -
ہ - ہر لفظ کی تذکیر و تانیث سے بھی بحث کیگئی ہے -
و - اس میں الفاظ کے ماخذ اور اصل کا بیان ہے -
ز - فلولوجی کے نقطۂ نظر سے، جن الفاظ کا اتحاد ہوا، اسکی توضیح کیگئی ہے -
ح - فصیح الفاظ کے ساتھ غیر فصیح الفاظ کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے جو ایک نہایت ضروری بات ہے -
ط - متروک الفاظ، انکی جگہ جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، انکا بیان ہے -
ی - ہر صوبہ کے الفاظ درج کئے گئے ہیں -
۳ - مستند شعراء کے کلام سے ہر جگہ سندیں دیگئی ہیں -
۴ - ان تبدیلیوں کا بیان ہے جو الفاظ یا محاوروں میں ہوئیں -
۵ - **الف** جو لفظ، یا محاورہ اصطلاح یا ضرب المثل جس طبقہ کے لوگوں میں استعمال ہوتی ہے اسے انکی طرف منسوب کر کے تشریح کیگئی ہے -
ب - اصطلاحوں کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے -
۶ - مختلف طبقہ کے لوگوں کی آوازوں کے متعلق معلومات دیئے گئے ہیں جیسے فقیروں کی صداؤں کا بیان، سودے والوں کی آوازوں کا حال، بچّوں اور عورتوں مخصوص فقروں کی کیفیت لکھی ہے -
۷ - پیشہ وروں کا روزمرہ، خاص فقروں مخصوص لب و لہجہ، اور تلفظ کا بیان ہے -
۸ - جہاں کہیں ضرورت ہوئی اشعار، ضرب الامثال، دوہے، بھجن، گیت، کبت، پہیلیاں، مکرنی،

ضلع جگت، انملیاں، دو نسخے پھبتیاں اور دو معنیاں لکھی ہیں۔

۹۔ عربی فارسی، ترکی، سنسکرت، پالی، بھاشا اور ہندوستان اور دوسرے ممالک کے قدیم وجدید زبانوں کے نئے اور پرانے الفاظ کے ساتھ ساتھ انگریزی کے جو الفاظ آجکل اُردو میں رائج ہوگئے ہیں انکو بالتفصیل لکھا گیا ہے۔

۱۰۔ محاورات کی صرف بہتات ہی نہیں ہے بلکہ انکے استعمال کے مختلف مواقع کا بیان بھی ہے۔

۱۱۔ جہاں کہیں ضرورت ہوئی ہے ضمناً سائنس وفلسفہ کے مسائل بھی لکھے گئے ہیں۔

۱۲۔ تاریخی واقعات، ہندوستان کے اولیا فقرا، اور علما، کے سوانح حیات، مع سنین وشہور درج کئے گئے ہیں۔

۱۳۔ عربی فارسی والوں، اور اُردو والوں کے اختلاف الفاظ اور اختلاف استعمال لفاظ کا بھی ذکر کیا گیا ہے

۱۴۔ تلمیحی الفاظ کے بیان میں انکی تاریخ، اور تلمیحات کے ذکر میں انکی پوری کہانی دی گئی ہے۔

۱۵۔ خاص خاص اشاروں کنایوں کا بیان بھی ہے۔

۱۶۔ ملک کے رسوم اور میلوں ٹھیلوں کے حالات بھی مورخانہ پیرایہ میں لکھے گئے ہیں۔

اُردو زبان کا یہ محسنِ اعظم اگر کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا تو ملک کے اہلِ قلم اسکی سینکڑوں سوانح عمریاں تالیف کرتے۔ اسکے یادگاری مجسمے نصب کئے جاتے، لیکن بدنصیب اردو دنیا اسے دس برس بھی یاد نہ رکھ سکی، مرحوم کے چند سطری حالاتِ زندگی حضرت خلیقی دہلوی نے بمشکل فراہم کرکے ہمیں بھیجے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ آج ہندوستان کے کسی کتب فروش کے پاس بھی مکمل طور پر نہیں ملتی گویا اردو پریس ایک مرتبہ اُسے شائع کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا ہے

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تونے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

تاجور

ناظرین ہمایوں کو اس تنقیدی سلسلے کی مختصر تاریخ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے :-

انجمن ترقی اردو کے آرگن رسالہ اردو میں شعر العجم پر مولانا محمود شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور لکچرار پنجاب یونیورسٹی کی ایک مسلسل تنقید شائع ہو رہی ہے، ڈاکٹر اقبال نے اسی سلسلے میں شعر العجم کے عمر خیام پر تنقید لکھ کر اپنے ہم مذاق دوست کی ہمنوائی کی تھی، اسکا جواب اڈیٹر صاحب معارف نے رسالہ معارف میں شائع کیا مندرجہ بالا مضمون اسکا جواب الجواب ہے،

پروفیسر شیرانی کی تنقید جس پر توجہ ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا درحقیقت ہمارے ذخیرۂ معلومات میں بیش بہا اضافہ کرتی ہے، انہوں نے شعر العجم پر نہ صرف نقادانہ نگاہ ڈالی ہے بلکہ ساتھ ہی تعمیری کام بھی جاری رکھا ہے، اور اپنی تحقیق و تلاش سے اکثر ایسی اطلاع بہم پہنچائی ہے جس سے ہمارے تذکرہ نگار عموماً بے خبر ہیں، انکی تنقید تاریخ کو افسانے سے اور حقیقت کو مجاز سے علٰحدہ کر کے شعرائے فارس کے اصل واقعات زندگی پر روشنی ڈالتی ہے، اور پرانی مگر بے اصل روایات کو جو عام طور پر مشہور ہو گئی ہیں رد کر دیا ہے، صاحب موصوف نے اپنی تنقید میں زیادہ تر قدیم ماخذوں اور اکثر اوقات خود شعرا کے کلام سے استدلال کیا ہے بلکہ کئی جگہ ایسے ماخذوں کا استعمال کیا ہے جن سے ہم واقف نہیں تھے، اڈیٹر صاحب اردو درحقیقت ادبی دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ادب فارسی کا ایسا عالیجاہ اور باخبر نقاد ڈھونڈھ نکالا،

انکی چار پانسو صفحات کی عمیق معلومات سے لبریز تنقید کے متعلق صرف یہ کہدینا کہ "وہ ناموں اور سنوں کی الٹ پھیر پر مبنی ہے" دراصل لفظ کا مناسب استعمال نہیں ہے اول تو علم اسماء الرجال پر فخر کرنے والے حضرات تاریخ میں سنین، مشہور اور ناموں کے اختلافات کو نظر انداز نہیں کر سکتے اس سے قطع نظر اس تنقید کو "ناموں اور سنوں کا الٹ پھیر بتانا" ان لوگوں پر اثر ڈال سکتا ہے جنہوں نے اس تنقید کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا ہے باقی جو علمدوست اسے بالاستیعاب پڑھ رہے ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے کہ "وہ ناموں اور سنوں کے الٹ پھیر" والے مغالطہ انگیز فقرہ کو تنقید کے کس حصّے کا جواب تصور کرینگے ؟ اڈیٹر صاحب معارف کے لفظوں میں "دنیائے ادب کے تجربہ کار سیاح" مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی تو اسکے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں

"رسالہ اردو میں شبلی مرحوم کی شعر العجم پر ایک محققانہ ریویو نکل رہا ہے جسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراضات تمام صحیح ہیں، مگر نقاد کو زیادہ ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیئے" (منقول از معارف)

مولانا شبلی مرحوم اردو زبان کے معیاری نقادوں میں غالباً سب سے بلند پایہ ہیں اردو زبان انکی

محققانہ، فلسفیانہ، اور نقادانہ خدمات کے احسان میں ہمیشہ دبی رہیگی پروفیسر شیرانی نے انکی اس عظمت کا اعتراف کیا ہے اور بحیثیت ایک انصاف پسند نقاد کے انہیں ایسا کرنا چاہیئے تھا لیکن مرحوم کا سب سے بلند پایہ نقاد ہونا ہی اس کا متقاضی ہے کہ اُنکی تنقیدیں سب سے زیادہ نقادانِ فن کی توجہ کی مستحق ہوں انکی تنقیدوں کو اصول تنقید پر پرکھنا مرحوم کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہے۔ پھر شعر العجم کے نقاد کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "طعنۂ نیطان کے وسیلہ سے اپنے اخلاق حسنہ کی پردہ دری" کررہا ہے نجانے علم کی سنجیدگی کیونکر اسکی اجازت دے سکتی ہے؟ باقی شعر العجم کی بابت یہ رائے کہ وہ "حسن وعشق کا صحیفہ ہے اس میں ہر شاعر کا تذکرہ سوانح پہلی چیز نہیں دوسری چیز ہے" اگر اسے تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس میں تذکرہ نگاری دوسری چیز ہے تو دوسری چیز، بھی اس قدر مردودِ توجہ نہیں ہونی چاہیئے۔ جیسا کہ حسب تنقید شیرانی اسکے ساتھ بے اعتنائی برتی گئی ہے ایک عہد کے شاعر کو دوسرے عہد کے شعرا میں ملا دینا ایک واقعہ کو ایک ہی کتاب میں دو شخصوں کی جانب منسوب کردینا زید کے اشعار کو عمرو کے سر تھوپ دینا وغیرہ یہ بے التفاتیاں تو دوسری چھوڑ آخری چیز کے لئے بھی نہیں برتی جاسکتیں۔ اسکے علاوہ سرے سے یہی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ادبیات کی ایک محققانہ تاریخ میں تحقیق کو تنقید سے دوسرے درجہ پر رکھا گیا ہے کم از کم مولانا شبلی مرحوم تو ایسا نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ شعر العجم کے اثنائے تصنیف میں جب اُنہیں کسی دوست نے لکھا کہ آپ فارسی ادبیات کی تاریخ پر کیوں قلم اُٹھارہے ہیں جبکہ اسی مضمون پر پروفیسر آزاد دہلوی بھی تصنیف کررہے ہیں"، تو مولانا مرحوم جواب میں لکھتے ہیں کہ:-

تم نے مجھے آزاد کے متعلق یہ خبر دیکر کہ وہ بھی اسی مضمون پر قلم اُٹھارہے ہیں ڈرا دیا، میں جانتا ہوں کہ آزاد تحقیق کا مرد میدان نہیں ہے۔ لیکن غلط سلط باتیں بھی جو اپنی زبان میں لکھ دیگا الہام معلوم ہونے لگینگی۔ (بمعناہ)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا شعر العجم کو ادب فارسی کی تنقید کے ساتھ ہی ایک محققانہ تاریخ بھی تصور فرماتے تھے۔

آخر میں ہم پروفیسر شیرانی کی خدمت میں تو یہ التماس کرینگے کہ وہ مولانا شبلی کی عظمت کو مدنظر رکھکر لہجہ کو پہلے سے زیادہ نرم کرلیں۔ اور محترم معاصر سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس تنقید کو رنگین عینک بدل کر ملاحظہ فرمائیں۔

"رحم اللہ من ھدانی الی عیوبی"

سمندر کی زبان سے

مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی

۱

جذبۂ قہرِ خدا، ہے مرے طوفاں کا جوش
میں ہوں تلاطم فروش
میں ہوں قیامت بدوش
سُن کے یہ میرا خروش
اُڑتے ہیں انساں کے ہوش
ہوتے ہیں ڈر سے خموش
جذبۂ قہرِ خدا، ہے مرے طوفاں کا جوش

۲

میں ہوں سدا لطمہ خیز، میں ہوں سدا موجزن
میری جبیں پُر شکن
میری ادا پُر فتن
جوش میں ہو کر مگن
کھیلتا ہوں میں گگن،
ہے یہ مرا بانکپن
میں ہوں سدا لطمہ خیز، میں ہوں سدا موجزن

۳

بادۂ پندار سے، مست ہوں مخمور ہوں
عیش سے مسرور ہوں
طیش سے معذور ہوں
نغمہ سے بھرپور ہوں
رقص پہ مجبور ہوں
شان پہ مغرور ہوں
بادۂ پندار سے، مست ہوں مخمور ہوں

۴

صبحِ ازل میں بھی تھا، ایسا ہی میں شوخ و شنگ
ضبط سے آتا تھا تنگ
اُٹھتی تھی دل میں ترنگ
ہوتی تھی موجوں میں جنگ
تھا یہی شوخی کا رنگ
تھا یہی ہل چل کا ڈھنگ
صبحِ ازل میں بھی تھا، ایسا ہی میں شوخ و شنگ

۵

میرے کناروں پہ تھیں، سلطنتیں حکمراں
پہنچا تھا جن کا نشاں
تا بسرِ آسماں
فوج تھی جن کی دواں
صورتِ سیلِ رواں

رکھتی تھیں جو عزّ و شاں
میرے کناروں پہ تھیں، سلطنتیں حکمراں

۶

گرد میں آلودہ ہیں، اُن کی وہ اب عظمتیں
چھُپ گئیں وہ صورتیں
چھٹ گئیں وہ سنگتیں
مِٹ گئیں وہ اُمتیں
لُٹ گئیں وہ دولتیں
دب گئیں وہ ہیبتیں
گرد میں آلودہ ہیں، اُن کی وہ اب عظمتیں

۷

کہدو یہ انسان سے، علم پہ شیخی نہ کر
ہیچ ہیں تیرے ہُنر
سَر نہ اُٹھا اے بشر
ہو نہ بہت خیرہ سر
حد سے نہ اپنی گزر
قہرِ الٰہی سے ڈر
کہدو یہ انساں سے، علم پہ شیخی نہ کر

خیالات

زندگی رنجوں اور مصیبتوں کی کشمکش سے لبریز ہے، اور موت راحتوں اور مسرتوں سے معمور۔ زندگی ابتداء سے انتہا تک رنج و غم، فکر و پریشانی کا مجموعہ ہے اور موت سدا بہار پھُولوں کا ہار۔ زندگی سرتاسر گرفتاری ہے اور موت سراپا آزادی۔ موت میں جو مزہ ہے زندگی اس سے خالی ہے؛ خواہ وہ زندگی سکندر و دارا کی ہو۔ یا خضر و آدم کی۔ زندگی بھر انسان جن چیزوں کے لئے ترستا رہتا ہے۔ موت وہ سب ہمیشگی کے ساتھ دے دیتی ہے۔ مرنے والا کبھی دنیا میں آنے کی خواہش نہیں کرتا، کیونکہ اس کا دل دنیا سے بیزار ہوجاتا ہے، اور اسکو موت کے مقابلہ میں زندگی دوزخ نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جو موت سے ڈرتے ہیں نادان ہیں، اور جو مرنے والوں کا رنج کرتے ہیں خودغرض ہیں، ڈرنے والا راحتوں اور خوشیوں سے ڈرتا ہے، اور رونے والا جدائی کے غم میں روتا ہے +

ناظر دہلوی

زندگی کی توقعات

ہمیشہ اس اُمید و توقع کو عادت بنالینا کہ زندگی کی بہترین اشیاء ہمارے ہی لئے بنی ہیں بہت ہی نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ اپنے چہرے پر بے اطمینانی کے آثار ظاہر نہ ہونے دو۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ خیال کرنے لگیں کہ دُنیا کی اچھی چیزوں میں سے تمہیں کوئی حصّہ ہی نہیں ملا۔ اپنے من کو بڑی بڑی اُمیدیں رکھنا سکھاؤ۔ اس طرح تم اپنی حالت کو بہتر بنا سکو گے۔ اگر تم اپنے متعلق بساط سے بڑھ کر بڑے بڑے کاموں کی اُمید رکھو گے تو یقیناً تم اپنے آپ کو انکے واسطے تیار کرنیکی کوشش کرو گے دُنیا کے آغاز سے آجتک جتنے بڑے بڑے کام ہوئے ہیں وہ ایسے لوگوں نے انجام دئے ہیں جو اپنی موجودہ حالت سے ہر وقت غیر مطمئن رہتے تھے۔

جو شخص تھوڑے ہی سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ جسے اس بات کا یقین ہے کہ وہ معمولی اوراد نےٰ کام کرنے کے واسطے ہی پیدا ہوا ہے۔ اور جو کچھ اسکے سامنے ہو اسی پر قناعت کر لیتا ہے۔ الغرض جو یہ کہتا ہے کہ

"ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا"

تو یقیناً وہ کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر سکتا۔ برخلاف اسکے جو آدمی اپنے آپسے بڑی امیدیں رکھتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنی تنگ زندگی کے میدان کو وسیع کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے محدود علم کو بڑھانا چاہتا ہے اور ترقی کرنے اور اپنے ساتھیوں سے بڑھ جانیکی کوشش کرتا ہے۔ اسکے اندر ترقی کرنے کا پاک جذبہ اسے اعلےٰ اور بڑے کام کرنے کی ترغیب دلانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور وہ بہترین چیزیں حاصل کرنیکی توقع رکھتا ہے۔

نوجوانوں کے دلوں میں عام طور پر یہ ایک غلط خیال جاگزین ہو گیا ہے کہ اصلی ترقی خداداد لیاقت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ بات انکے راستے میں بڑی روک کا باعث ہوتی ہے۔ ایک نوجوان کے لئے محض اس خیال سے کہ وہ خاص طور پر قابل و لائق نہیں پیدا کیا گیا اپنے قیمتی سال شک و شبہ میں گذار دینا ایسا ہی نقصان دہ اور غیر معقول ہے جیسا کہ ایک رائی کے دانے کا اس وجہ سے اُگنے سے انکار کرنا کہ وہ ایک بڑا درخت نہیں ہو سکتا۔ یا ایک انگور کی بیل کیلئے بڑھنے سے محض اس وجہ سے انکار کرنا

کہ وہ بڑھ کر ایک پیپل کا درخت نہیں ہو سکتی۔ پیپل کے درخت کے بیج کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ بڑ کا درخت یا گلاب کا پودا ہو سکے۔ وہ اُگ کر پیپل کا درخت ہی ہوگا۔ یہ "خداداد لیاقت" دنیا میں ہرگز اس قدر نہیں پائی جاتی جتنا کہ لوگوں کا خیال ہے۔ یہ "خداداد لیاقت" وہ ہے جس کی بابت انگلستان کے مشہور مصوّر سر جوشا رینالڈس لکھتے ہیں:-

"یہ ایک طاقت ہے جس کی مدد سے انسان وہ اعلیٰ ترین و محیر العقول کام کر سکتا ہے جنہیں علم و ہنر کے قواعد احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو زیادہ سے زیادہ محنت سے بھی حاصل نہیں کیجا سکتی"، بدقسمتی سے عام طور پر لوگوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ کئی آدمیوں میں ایک خاص خداداد طاقت کی روح بھری ہوتی ہے اور یہ کہ انہیں ایک ایسا غیر معمولی عطیہ ملا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے کام بلا کسی محنت و مشقت کے کر جاتے ہیں۔ جتنا جلدی ان خام خیالات کو دل سے دُور کیا جائے اُتنا ہی بہتر ہے۔

اصلی معنوں میں کامیاب آدمیوں میں سے بہت کم یہ بتا سکتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر چل کر وہ اس قدر کامیاب ہوئے۔ وہ ایسا محسوس کرتے ہیں گویا کوئی نظر نہ آنے والی طاقت انہیں اس راستے پر چلاتی رہی ہے۔ مگر در اصل انہوں نے اُس راستہ کو صرف اسلئے اختیار کیا کہ ان کی سوچ میں اس وقت یہی بات آئی تھی۔ کوئی شخص بھی اپنی زندگی کے انجام کو شروع میں نہیں دیکھ سکتا۔ وہ صرف تھوڑا سا آگے دیکھ سکتا ہے۔ اسکی رہنمائی کیلئے کوئی ستارہ مقرر نہیں ہوتا جو اُسے دُور ہی سے اشارہ کر کے سیدھے راستے پر چلائے۔ بلکہ اسکا رہنما تو وہی لمپ ہوتا ہے جو اسکے ہاتھ میں ہے۔ یہ لمپ صرف چند ہی قدم تک اسکے سامنے راستے کو روشن کر سکتا ہے۔ جسکی وجہ سے وہ دوسرا قدم یقین کے ساتھ اور بے خطر اُٹھا سکتا ہے۔ اس سے آگے سب کچھ دھند اور غبار میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے وہ لمپ اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اسکا راستہ روشن کرتا جاتا ہے۔

جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم ٹھیک رستے پر چل رہے ہیں تو ہمارے لئے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اپنے سفر کا دور دراز تک اندازہ کر لیں۔ ایک وقت میں ہم صرف ایک ہی قدم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اپنے دل کو خواہ مخواہ توہمات اور فکر میں ڈالنا کہ نہ معلوم آگے چل کر ہمیں کیا کیا روکاوٹیں پیش آئیں بالکل بے سود بلکہ نقصان دہ ہے۔

تمام زندگی کو ایک ہی نظر میں دیکھ لینے کی کوشش کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ لیکن ہر روز بہترین زندگی بسر کرنیکی کوشش کرنا۔ اور یہ پختہ ارادہ کرنا کہ اس دن کیلئے کم ازکم ہمارا مطمح نظر نیچا رہنا نہ ہوگا۔ بلکہ ترقی کرنا ہوگا۔ یہی اصلی اور سچی زندگی ہے۔ اور یہی بات ہے جس سے انسان میں پختہ مزاجی آتی ہے۔ ہمیشہ ترقی کرنیکی کوشش کرنا اور اپنے مطمح نظر کو بلند رکھنا ایک ایسی چیز ہے جس سے بڑھ کر دنیا میں دل کو طاقت دینے والی اور اُبھارنے والی اور تخیل کو وسیع کرنیوالی اور کوئی شئے نہیں۔ خواہ تمہارا پیشہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اپنا مطمح نظر بلند رکھنے کی کوشش کرو۔ بلکہ اس میں اپنے آئیڈیل کو بھرنے کی کوشش کرو۔ اور اس بات کا یقین کرلو کہ تمہارے آئیڈیل میں بلندی ہے۔ اور اس میں اُبھارنے کی خاص صفت ہے۔

امریکہ کے مشہور و معروف مصنف تھورو لکھتے ہیں "کیا تم نے کبھی ایسا آدمی بھی دیکھا ہے جس نے تمام عمر کسی چیز کو حاصل کرنیکے لئے لگاتار اور باقاعدہ کوشش کی ہو اور پھر اسکے حاصل کرنے میں ناکام رہا ہو؟ کیا محض بلند خیالی ہی کو ہمیشہ مدنظر رکھنا انسان کو ایک بالاتر مرتبے پر نہیں پہنچا دیتا؟ کیا دنیا میں کبھی کوئی ایسا آدمی بھی ہوا ہے جو ہمیشہ بہادری۔ عالی ہمتی۔ سچائی اور صداقت ہی پر قائم رہا ہو اور پھر اس نے یہ محسوس کیا ہو کہ ان میں کوئی فائدہ نہیں اور یہ اسکی سب کوششیں بیکار تھیں؟"

ہم میں سے بہتیرے اپنی خلاف فطرت زندگی، بُرے فضول خیالات اور کم ہمتی کی وجہ سے اپنے اردگرد گویا دیوارسی بنا دیتے ہیں اور اس طرح اپنے آپکو زندگی کی بہترین چیزوں سے محروم کر دیتے ہیں نکتہ چینی۔ بے اطمینانی اور اپنے اردگرد کی چیزوں میں ناامیدی و تاریکی ہی دیکھنا۔ یہ گویا ان دیواروں کے لئے بمنزلہ اینٹ اور پتھر کے ہیں۔ تشویش۔ فکر۔ تکلیفیں انکے لئے بطور گارا مٹی کے ہیں۔ ہم اپنی کوتاہ نظری سے ان دیواروں کو اتنا بلند کر لیتے ہیں کہ ہم روشنی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ کوئی آدمی بھی ان خودساختہ دیواروں کے اوپر سے باہر کی دنیا کو نہیں دیکھ سکتا۔

مطمح نظر کیا ہے؟ یہ ایک مدعا ہے جو ہماری زندگی پر بہت ہی اثر انداز ہوتا ہے یہ ہماری آرزوؤں پر اثر ڈالتا ہے۔ ہمارے کاموں کو ڈھالتا ہے۔ ہماری قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہماری تمام زندگی کا میلان اسی کی طرف ہوتا ہے۔ اگر ہمارا آئیڈیل نیچا ہوگا تو ہم کم ہمت ہی رہینگے۔ برعکس اس کے اگر ہمارا مطمح نظر بلند و اعلٰے ہوگا تو ہماری زندگی بھی برتر ہوگی۔

ہماری خواہشیں اور مقصد ہمارے چہرے سے صاف صاف عیاں ہوتے ہیں۔ جو شخص ہم سے

ذرا بھی واقف ہو وہ فوراً تاڑ لیتا ہے کہ ہم کس چیز کے لئے اس قدر کوشاں و خواہشمند ہیں۔ ہمارے رگ و ریشہ سے ہمارا مقصد ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارا آئیڈیل ہمارے کاموں سے ایسا ہی صاف طور پر نمایاں ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے الفاظ و گفتگو سے ہماری شخصیت۔ ہمارا آئیڈیل ہر وقت جڑ پکڑنے اور ہمارے خط و خال سے عیاں ہونا چاہتا ہے۔

تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپکو ایک حیوان کے درجے سے نکال کر حقیقی معنوں میں انسان بنائے۔ اس مطلب کے حصول کے لئے یہ لازمی ہے کہ انسان شروع ہی سے اپنے لئے ایک بلند آئیڈیل منتخب کرے۔ جو شخص حقیقی کامیابی و اصلی تربیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسکے لئے اگر کوئی قابل اطمینان راستہ ہو سکتا ہے تو یہی ہے کہ وہ لگاتار ایک بلند مطمح نظر اپنے سامنے رکھے۔ مردانگی ایک ایسا پودا ہے جو محض روحانی روشنی ہی میں پرورش پا سکتا ہے۔ اسکی کلیاں تنگ و خود غرض طبیعت میں رہنے سے مرجھا جاتی ہیں۔ خود غرضی کبھی کمال کے پھولوں کو نشو و نما حاصل کرنے کا موقعہ نہ دیگی۔

ایک نوجوان جس نے زندگی کی جد و جہد ابھی شروع کی ہو۔ اور جو اپنے لئے ایک معقول سرمایہ کمانے کے خیال میں محو ہو۔ وہ یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ یہ کم بخت روپیہ جمع کرنیکی ہوس دن بدن بڑھتی ہی جائیگی۔ اور آخر کار اتنی زبردست ہو جائیگی کہ اسکے تمام لطیف احساسات و اعلیٰ جذبات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیگی۔ وہ آدمی جو ہر وقت اس دھن میں لگا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح دوسروں سے بڑھ جائے۔ وہ بغیر جانے اپنی اُن تمام خوبیوں و خاصیتوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ جنکی نشو و نما کا اگر وہ کچھ بھی خیال کرتا تو وہ اسکی زندگی کو ایک سرمایۂ ناز چیز بنا دیتیں۔ وہ آدمی جسکو ہر وقت چالاکی۔ فریب دہی و مکاری کا سبق ملتا ہے۔ جو ہر وقت دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانے کی تاک میں رہتا ہے۔ جو ہر چیز کی قیمت کا اندازہ روپوں ہی سے کرنا چاہتا ہے۔ الغرض جس آدمی کو محض یہی سکھایا جاتا ہے کہ وہ کس طرح زندگی کی کشمکش میں مایوسی و ناکام شدہ آدمیوں کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کر سکتا ہے اور اپنی ترقی کے زینے پر چڑھنے کے لئے اُن سے مدد لے سکتا ہے۔ تو وہ ایسی تعلیم حاصل کر رہا ہے جو اسے سخت دل حیوان بنا دیگی۔ اور اسکی روحانی ترقی کا راستہ بالکل بند کر دیگی۔ تعلیم و تربیت کا اعلیٰ ترین مقصد یہی ہے کہ انسان اپنی سرشت کی بہترین خوبیاں اپنے اندر پیدا کرے۔ تاکہ وہ نہ صرف فہیم۔ قابل و عقلمند ہو بلکہ وسیع القلب۔ ہمدرد دل۔ سخی اور آزاد طبیعت بھی ہو سکے۔ جس شخص نے عمدہ تعلیم و

تربیت حاصل کی ہوگی وہ اپنی زندگی میں "سنہری اصول" کے قواعد ظاہر کرسکیگا۔ وہ یہ جان لیگا کہ دوسروں کی زندگی محض اس لئے نہیں کہ وہ اُن سے فائدہ اُٹھائے۔ بلکہ وہ یہ محسوس کریگا کہ ہر شخص کیلئے بہترین بات یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کام آئیں۔ لیکن جو تعلیم ان نتائج کے حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ جو زندگی کو پُر محبت و پُر لطف نہیں بناتی جو اسے طاقت و روشنی نہیں پہنچاتی وہ تعلیم کہلانے کی مستحق نہیں۔

لوگوں کے عام خیالات کے بموجب اپنے کاروبار میں کامیابی حاصل کرنا ایک الگ بات ہے۔ اور زندگی میں حقیقی کامیابی حاصل کرنا بالکل الگ۔ دُنیا میں سینکڑوں آدمی ایسے مل سکتے ہیں جو باوجود اپنے کاموں میں ناکام رہنے کے بھی اپنی زندگی میں اعلیٰ درجے کے کامیاب آدمی شمار کئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ اپنے بلند مقصد پر چلنے کی کوشش کی ہے جو شخص ہر حال میں اپنی بساط بھر پوری کوشش سے کام کرتا ہے جو اپنی لیاقت سے پورا فائدہ اُٹھاتا ہے اور کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ جو جب کبھی اُس سے ہوسکتا ہے نوع بشر کی مدد کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ جو ہر موقعہ پر پوری توجہ و تندہی سے کام کرتا ہے جو اپنی دوستی میں باوفا اور سچا ہے۔ جو سب کے ساتھ محبت۔ دریا دلی۔ و ہمدردی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ وہ اصلی معنوں میں کامیاب شخص کہلانے کا مستحق ہے۔ اگرچہ وہ اپنے مرنے پر اس قدر روپیہ بھی نہ چھوڑ جائے جو اسکے کفن خریدنے کو کافی ہوسکے ایک خودغرض و کم ہمت آدمی اپنے آپکو حقیقی معنوں میں بلند پایہ آدمی کبھی نہیں بناسکتا۔ ایسا بننے کے لئے یہ یہ ضروری ہے کہ مطمح نظر اعلیٰ و بلند ہو۔ ارادہ مضبوط۔ نیک اور سچا ہو۔ ورنہ زندگی میں سراسر ناکامی ہوگی۔ جو شخص ہر وقت یہی منصوبے باندھتا رہتا ہے کہ کس طرح اوروں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاکر خود ترقی کرے وہ کبھی جوانمردی کے حقیقی جاہ و وقار کو حاصل نہیں کرسکتا۔ دُنیا میں ہزاروں لاکھوں آدمی ایسے ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ محض روپیہ جمع کرنا ہی اصلی کامیابی ہے۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ اصل میں وہ سب کچھ گنوا رہے ہیں جس کے لئے وہ اس قدر کوشاں ہیں۔ وہ اپنے خیال کے مطابق یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ایک دفعہ کافی روپیہ جمع کرلیں پھر اسکی بدولت سب کچھ حاصل ہوجائیگا۔ مگر درحقیقت وہ اصلی دولت جسکے بغیر روپیہ کسی کام کا نہیں وہ کھو بیٹھتے ہیں۔

انسان حیوان نہیں ہے۔ سانس لینا۔ کھانا۔ پینا اور سو جانا۔ یہ زندگی نہیں کہلا سکتا۔ محض روٹی سے ہی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ سچ ہے کہ انسان کے اندر خوراک کی بڑی زبردست خواہش ہوتی ہے مگر ایک اعلیٰ تربیت یافتہ شخص میں اپنے لطیف جذبات کو بڑھانے اور روحانی ترقی حاصل کرنے کی خواہش اور بھی زبردست ہوتی ہے۔ ہماری روح کے لئے اعلیٰ بننے کی خواہش کرنا ایسا ہی قدرتی فعل ہے

جیساکہ گھاس کیلئے اُگنا یا درخت کے لئے بڑھنا۔ ایک مشہور مصنف لکھتے ہیں۔

"اگر انسان اپنا تمام وقت محض کھانے پینے اور سونے میں گذار دیتا ہے تو وہ حیوان سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتا۔ یقیناً خدائے عز وجل جس نے اپنی انتہائی دانائی سے انسان کو پیدا کیا۔ اس نے ہمیں یہ دماغ اور اتنی طاقت اسلئے نہیں دی کہ اس سے کوئی کام ہی نہ لیا جائے اور بیکار رہ کر اسے زنگ آلود ہونے دیا جائے"

جب ہم کسی لڑکی یا لڑکے کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنا وقت ضائع کرنیکی بجائے اپنی تعلیم و تربیت پر لگاتا ہے۔ اور اپنے فرصت کے گھنٹوں کو اوروں کی مانند محض بیکاری میں ضائع کرنیکی بجائے اپنے آپ کو بہتر بنانیکی کوشش میں صرف کرتا ہے۔ تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ایسی دولت جمع کرنیکی فکر میں ہے جو عام دولت کی طرح ضائع ہو جانے والی نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے آپکو مفید تر و بہتر بنانیکی خواہش رکھتا ہے اور کسی موقع کو بھی نہیں گنواتا بلکہ اپنی تربیت میں ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ایک دن ضرور اعلےٰ درجے پر پہنچ جائیگا۔ اور اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں انسان بنا دیگا۔

اس دُنیا میں ایک ایسے نوجوان کو دیکھنا جو ہر ممکن طریقہ سے اعلےٰ وارفع بننے کی کوشش کر رہا ہو۔ جو اپنی زندگی کو پہلے سے زیادہ خوبصورت۔ پُر لطف، صداقت آمیز و وسیع بنانے میں ہمہ تن مشغول ہو ایک بہت ہی اعلےٰ منظر ہے۔ اگر تم ہر وقت دوسروں کی مدد کرنیکی کوشش کرتے ہو۔ اور اُن سے محبت۔ بے غرضی و ہمدردی کا اظہار کرتے ہو اور انہیں ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہو تو یقین رکھو کہ ایسا کرنے سے تمہاری اپنی زندگی بھی دن بدن پہلے سے زیادہ قیمتی اور پُر لطف بنتی جائیگی۔ یہی دولت ہے جو زندگی تک ساتھ دیتی ہے۔ یہی ایسا سرمایہ ہے جسے نہ آگ جلا کر تباہ کر سکتی ہے اور نہ دریا بہا کر لیجا سکتے ہیں۔ اور نہ منڈی کے اتار چڑھاؤ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہ انسان کی زندگی و مردانگی کا جزو بن جاتی ہے۔ یہ سونے کی مانند ہے۔ جسکو نہ آگ جلا سکتی ہے۔ اور نہ کسی اور چیز کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ نہ عناصر اسکی چمک کو کم کر سکتے ہیں اور نہ حسد و بغض اس کی قیمت گھٹا سکتے ہیں +

ترجمہ

گوتم دیو
اسلامیہ کالج لاہور

مُسافِر کا گیت

شب تار ہے بحرِ ظلمت رواں ہے
سیاہی سے معمور سارا جہاں ہے
سکوں ہے خموشی ہے خوابِ گراں ہے
بیاباں میں مدہوش ہر کارواں ہے
مگر میری قسمت میں راحت کہاں ہے۔ مسافر ہوں پیہم چلا جا رہا ہوں

جبینیں ہُوئیں خاکساروں کی نوری
رہی کوہکن کو نہ وہ ناصبوری
ہُوئی قیسِ مضطر کو حاصل حضوری
تمنا غرض ہوگئی سب کی پُوری
مگر ہے وہی مجھکو منزل سے دوری مسافر ہوں پیہم چلا جا رہا ہوں

ہوا سُست رو کاروانِ حجازی
کمر کھول کر سو گیا مردِ غازی
ہُوئے جمع صحنِ حرم میں نمازی
سفر آشنا اب ہے ترکی نہ رازی
مگر ہاں وہی ہے مری ترکتازی مسافر ہوں پیہم چلا جا رہا ہوں

نہ دل میرا خائف ہے چشمِ زحل سے
نہ جان میری لرزاں ہے خوفِ اجل سے
میسّر ہیں عیش و مسرت کے جلسے
شب و روز ہے کام شعر و غزل سے
مگر عرصۂ زندگی میں ازل سے مسافر ہوں پیہم چلا جا رہا ہوں

اصغر حسین خاں نظیر
لودیانوی

اخلاقیاتِ اجتماعیہ

گذشتہ سے پیوستہ

اب ہمیں اطلاقی مفہوموں سے ہٹ کر محض ملکات نفسیہ پر نظر رکھنی چاہیئے اور اسی اعتبار سے دیکھنا چاہیئے کہ محاسن اخلاق کیا کیا ہیں؟

محاسن کے چار بنیادی رکن۔ جب سے اخلاقی تحقیقات شروع ہوئی ہے، حکمائے اخلاق محاسن کی مختلف صورتوں کا شمار کر رہے ہیں، اور انکی یہ کوشش ہے کہ محاسن اخلاق کی ایک مکمل فہرست بنالیں۔ متعدد علمائے نے ایسی فہرستیں بنائی ہیں مگران میں سب سے زیادہ مشہور وہ فہرست ہے جو افلاطوں کے نام سے مشہور ہے۔ وہ جزئیات کے احصا کو ناممکن اور بیکار سمجھ کر اصول کو لیتا ہے اور تمام محاسن کو ۴ بنیادوں پر قائم کرتا ہے:- حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت۔ ان چاروں الفاظ کے عام طور پر جو معنی لئے جاتے ہیں انکی رُو سے ایک شخص کو حیرت ہوگی کہ انہیں امہات فضائل کیونکر قرار دیا گیا، لیکن فلاطوں نے جن وسیع معنوں میں انہیں لیا ہے ان پر اگر غور کیا جائے تو تمام فضیلتیں اپنی اصلیت میں انہی چاروں کے ماتحت آجاتی ہیں اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ جس شخص کی سیرت ان چاروں بنیادوں پر قائم ہو وہ ایک مکمل انسان ہے، ذیل میں ہم ایک ایک کی کچھ تشریح کرینگے۔

عدالت۔ ابنائے جنس کے ساتھ معاملات و تعلقات کو درست کرنیکے لئے جتنے محاسنِ فضائل کی ضرورت ہے ان سب پر یہ لفظ حاوی ہے۔ عام بول چال اور قانونی اصطلاح نے اسکے وسیع مفہوم کو بہت تنگ کردیا ہے جس کی وجہ سے عدالت کے معنی صرف قانونی احکام کی فیصلہ گاہ اور دادرسی تک محدود رہ گئے ہیں۔ لیکن حکمی حیثیت سے وہ نہ صرف جماعت بلکہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ دیانت و راستبازی کے ساتھ معاملت کرنیکے معنی رکھتا ہے۔ دیانت، راستبازی، انصاف، خوش معاملگی، وغیرہ مختلف الفاظ بولنے کے بجائے اس ایک لفظ کو بول دینا ان تمام محاسن اخلاق کو ظاہر کرنیکے لئے کافی ہوگا جو معاملات کی درستی اور تعلقات کی شگفتگی سے علاقہ رکھتے ہیں۔ ایک کامل عدالت شعار آدمی وہ ہے جو ہر شخص سے یکساں تعلق رکھے، کسی کی بیجا رعایت و جانبداری نہ کرے، نہ کسی کے ساتھ بیجا زیادتی کرے، جو شخص اسکی جتنی رعایت و مہربانی کا مستحق ہو اس پر اتنی ہی عنایت صرف کرے، معاملات میں کھرا اور ملنے میں شرافت کیش رہے۔ کسی کے

حق میں دست اندازی نہ کرے، ادائے حقوق میں تغافل شعاری سے کام نہ لے، اپنے فرائض کو ادا کرنیکے لئے ہر وقت مستعد رہے، سختی کی جگہ نرمی اور نرمی کی جگہ سختی نہ برتے، مروت کا غلط استعمال نہ کرے، ملنے میں خندہ جبیں، خوش مزاج، متواضع، اور حلیم ہو، اور معاملت میں کھرا اور صاف ہو۔ غرض یہ کہ ایسی تمام صفات عدالت سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ صرف افراد بلکہ جماعت میں بھی ایک ایسا نظام قائم کرنا جسکے ماتحت ہر چیز ہر شخص کیلئے ہو، کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، رعایت اور سختی استحقاق پر مبنی ہو، اور ہر فرد کے مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے، یہ سب عدالت کا تقاضہ ہے۔

شجاعت۔ شجاعت کو لوگ عام طور پر میدان والی بہادری کے معنی میں لیتے ہیں، اور اگر کوئی زیادہ وسعت اختیار کرتا ہے تو مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنیکو بہادری کہدیتا ہے، لیکن درحقیقت شجاعت اپنے اصلی معنوں میں خوف الم کی مدافعت کا نام ہے۔ اور وہ بہت سے مستقل محاسن اخلاقی پر حاوی ہے مثلاً نصب العین کی راہ میں جو خطرات ہوں انکے باوجود ارادہ پر قائم رہنا عزیمت ہے، مشکلات کا مقابلہ کرکے راہ عمل پر سرگرم رہنا بہادری ہے، مصائب سے ہمت کو پست نہ ہونے دینا صبر ہے، اور کسی بلند مقصد کے لئے ادنے لذتوں کو قربان کردینا فدویت ہے۔ بعض لوگ شجاعت کی ان سب قسموں کو دو بڑی تقسیموں پر منقسم کرتے ہیں ایک فعلی شجاعت یعنی خطرات کے مقابلہ میں پسند کردہ راہ پر چلنا اور اسے وہ بہادری سے تعبیر کرتے ہیں، اور دوسرے انفعالی شجاعت یعنی مصیبتوں کا فراخ حوصلگی سے مقابلہ کرنا اور اسے وہ صبر کہتے ہیں۔ مسٹر برانٹ نے اپنی کتاب "Objects of Education" میں ان دونوں کا موازنہ کیا ہے اور آخر الذکر کو اول الذکر پر ترجیح دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "صبر بہادری سے بہتر ہے کیونکہ بہادری صرف خوف الم سے آنکھیں بند کر لینے کو کہتے ہیں اور صبر عملاً تکلیفوں کی برداشت اور استقلال کے ساتھ مقصد پر قائم رہنے کا نام ہے"

بعض اور لوگ بھی صبر کو بہادری پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن دراصل صبر بہادری کی تکمیل کیلئے ایک مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرکے حصول مقصد کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے تو وہ کامیاب انسان نہیں ہو سکتا۔ پس بہادر آدمی صابر بھی ہوگا اور محض صابر بہادر نہیں ہوگا۔

عفت۔ عفت لغت عام میں پاکبازی کو کہتے ہیں، اور اخلاق کی اصطلاح میں بھی وہ اس اعتدالی حالت کا نام ہے جو شہوت و خمود کے درمیان ہوتی ہے لیکن اگر اس لفظ کو وسیع معنوں میں لیا جائے تو یہ ان تمام وساوس شیطانی کے مقابلہ پر حاوی ہے جو انسان کو اس کی تکمیل مقصد سے روکتی اور اسکو بلند اخلاقی سیرت تک پہنچنے سے باز رکھتی ہیں۔ شہوت پرستی و ہوسناکی سے بچنا، بے غیرتی و بیحیائی سے احتراز کرنا، ذلیل کاموں سے پرہیز کرنا اور حرص و

آز کی بندگی میں نہ پڑ جانا اور ایسے ہی تمام محاسن اخلاقی عفت کے تابع ہیں۔

حکمت ۔ ان سب اعہات فضائل سے زیادہ اہم ایک اور فضیلت ہے جو تمام محاسن کی رُوح ہے۔ اگر اسکی شرکت کسی کام میں نہ ہو تو خواہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کتنا ہی افضل و احسن ہو مگر معیار اخلاق پر پورا نہیں اُتر سکتا یہ فضیلت حکمت ہے۔ اس سے مراد وہ قوت امتیاز ہے جس کے ذریعہ انسان کھوٹے کھرے، اور صحیح و غلط میں فرق کرتا ہے اور ہر کام میں راہ صائب اختیار کرتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص میں شجاعت کا مادہ ہے مگر حکمت نہیں تو وہ کبھی اعتدال کی حالت پر قائم نہیں رہ سکتا، ہر ہر قدم پر افراط و تفریط سے اسکا کام خراب ہو گا اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص عفت شعار ہے مگر اس میں اتنی عقل نہیں کہ اپنے اس مادہ عفت کے صحیح مصرف کو معلوم کر سکے تو وہ ضرور صراط مستقیم سے ہٹ جائیگا۔ پس حکمت اعہات فضائل میں بھی اصل بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔

ان چاروں محاسن کی تھوڑی تھوڑی تشریح سے تمہیں معلوم ہو گیا کہ یہ تمام انسانی فضائل پر محیط ہیں اگر یہ کسی انسان میں جمع ہوں تو وہ اپنی سیرت و کردار دونوں کے اعتبار سے ایک مکمل اور کامیاب انسان ہو گا اور سوسائٹی کا بہترین فرد تسلیم کیا جائیگا لیکن فطرت بہت کم انسانوں پر اتنی فیاضی صرف فرماتی ہے، عام طور پر غیر معمولی انسانوں کا بھی یہ حال ہے کہ اعہات محاسن میں سے ایک دو سے زیادہ انہیں عطا نہیں ہوتا، عدالت ہوتی ہے تو عفت و شجاعت نہیں ہوتی، شجاعت ہوتی ہے تو عفت و عدالت نہیں ہوتی، اگر یہ سب ہوتی ہیں تو حکمت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ تاہم وہ لوگ انسانی سوسائٹی میں عام سطح سے بلند ہوتے ہیں جن میں کوئی ایک فضیلت حکمت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

جزئیات و فروع ۔ اوپر کی بحث سے تمہیں معلوم ہو چکا کہ چار بنیادی محاسن ہیں جو تمام محاسن اخلاقی کی اصل ہیں۔ مگر بعض علمانے جزئی محاسن کا احصا کرنیکی بھی کوشش کی ہے چنانچہ ارسطو جزئی محاسن کی فہرست مرتب کرتا ہے اور اپنے استاد سے اس خیال میں اختلاف کرتا ہے کہ صرف اعہات کا بیان کر دینا کافی ہے مگر یہ تفصیلی فہرست اول تو نامکمل ہے، دوسرے اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ عام انسانی فضائل کے بجائے ایتھنز کے شہریوں کے فضائل کو پیش نظر رکھا ہے جس کی وجہ سے اسکی قدر و قیمت بہت کم ہو گئی ہے۔ یہ فہرست آج نہ صرف ہمارے لئے بلکہ خود یونانیوں کے لئے بھی بیکار ہے۔ عہد حاضر کے علماء نے بھی تفصیلی فہرست بنانیکی کوشش کی ہے چنانچہ پروفیسر میورہڈ نے اپنی کتاب "Elements of Ethics" میں ایک ایسی ہی فہرست نقشہ کی صورت میں درج کی ہے۔ پروفیسر ایڈلر نے بچوں کی اخلاقی تعلیم کے عنوان

سے ایک لیکچر میں ان محاسن کو جمع کیا ہے جو زیادہ تر بچوں میں پرورش کئے جانے چاہئیں۔ ایک اور فہرست Moral education league نے مدارس کے طلبا کی اخلاقی تربیت کیلئے مرتب کی ہے، مگر ہمارے خیال میں تمدن جدید کی وسعت کو دیکھتے ہوئے تمام محاسن اخلاقی کو جمع کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ بے معنی بھی ہے، اس بارہ میں افلاطوں کی رائے بہت صائب ہے اور اسی کا اصول قابل تقلید ہے۔

اب اس تحقیق کے بعد کہ وہ محاسن سیرت کیا ہیں جنہیں ہمکو اپنے اندر پرورش کرنا چاہیئے، ہم اجمال کے ساتھ ان وسائل سے بحث کرینگے جو انکی ترقی کیلئے ممد ہوتے ہیں۔ اسکے لئے ہمیں نفسیات کے دائرہ میں قدم رکھنا پڑیگا اور نفسیات کے متعلق یہ سب کو معلوم ہے کہ وہ اس حیثیت سے ابھی ناقص ہے۔

"تربیت محاسن کے وسائل" ۔ سیرت کی ترقی پر نمونہ یا مثال کا جو اثر پڑتا ہے اسکے ذکر کی یہاں چنداں ضرورت نہیں، اس طرف ہر عالم اخلاقیات نے توجہ صرف کی ہے اور اس اثر کے مظاہر پر ایک وافر لٹریچر پیدا ہوگیا ہے[1]۔ اجتماعی تعلقات میں ایک کا دوسرے سے اثر پذیر ہونا ایک ایسی عام بات ہے جسے فلسفیانہ حیثیت سے پیچیدہ بحثوں میں پیش کرنا غیر ضروری ہے، ہر شخص اس کو جانتا اور رات دن اسکے نتائج محسوس کرتا ہے۔ مگر افراد کے افراد پر اثرات اتنے زیادہ اہم نہیں ہوتے جس قدر جماعتوں کے اخلاقی اثرات افراد پر یا قومی افراد کے اخلاقی اثرات جماعت پر ہوتے ہیں۔ ایک شخص جس کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے یا بالکل اسکے رنگ میں رنگ جاتا ہے یا اگر ایک مضبوط شخصیت اور سیرت کا مالک ہوتا ہے تو اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ پس اخلاقی تکمیل کے لئے افراد کا باہم رابطہ اور اس رابطہ کا صحیح اصولوں پر قائم ہونا ضروری ہے۔ شلر نے خوب کہا ہے کہ "یا تو آدمی کل ہو جائے یا اپنے تئیں کسی کل سے وابستہ کر دے" ہیگل نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "تم اس وقت تک کل نہیں ہو سکتے جب تک خود کسی کل سے وابستہ نہ ہو جاؤ"، ان دونوں مقولوں کو اگر ایک کرو تو تم ضرور اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ انسان کسی جماعت کی اخلاقی رہبری کے قابل ہونے کے لئے بھی اس کا محتاج ہے کہ کسی سوسائٹی کے نظام اخلاق میں تربیت پائے۔ سیرت کی مکمل ترقی اسی صورت میں ممکن ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل کر اپنے تئیں کسی بڑی غایت کیلئے وقف کر دیا جائے۔ اس کل میں مختلف آدمیوں کی مختلف حیثیت ہوتی ہیں، کسی کو عملی کاموں سے دلچسپی

---

[1] ہربرٹ کی علم التعلیم، گیو کی تعلیم و توریث، برانٹ کی مقاصد تعلیم، روزانکز کی فلسفہ تعلیم، اور ایڈلر کا لکچر بچوں کی اخلاقی تعلیم پر ان چند کتابوں میں سے ہیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

ہوتی ہے، کوئی طلب علم سے رغبت رکھتا ہے، بعض کو تصنیف و تالیف محبوب ہوتی ہے، بعض سیاسیات سے شغف رکھتے ہیں، کوئی شاعری یا مذہب کا شیدا ہوتا ہے غرض ہر شخص ہیئت اجتماعی کا کسی نہ کسی پہلو سے ایک رکن ہوتا ہے اور اپنی ذات کے محدود عالم سے وسیع تر عالم میں جانیکے لئے اسے اس علاقہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے اگر انسان ایسا نہ کرے تو وہ اپنی ساری ذہنی قابلیتوں کو ناکارہ کردیگا اور اسکی زندگی ایک ایسے قطعہ زمین کی سی ہوگی جو ایک عرصہ تک انسانی آبادی سے دُور رہنے کی وجہسے اپنی روئیدگی کی قوتیں کھو چکا ہو۔

پس تکمیل سیرت اور تربیت محاسن کے لئے جو چیز لازمی ہے وہ مدنیت اور اجتماعی روابط ہیں۔ ہمیں ایک بلند مقصد کے لئے اپنے آپ کو دوسروں کے ساتھ متحد کردینا ضروری ہے۔ جبتک یہ نہ ہوگا، ہم کوئی فضیلت اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتے۔ ایک انسان میں ملکۂ عفت کیا پیدا ہوسکتا ہے، جبکہ اسکے لئے وساوس اور جذبات شیطانی نہ ہوں اور وہ انکا مقابلہ کرکے اس ملکہ کو پرورش نہ کرے؟ کوئی شخص شجاعت کی قوت اپنے اندر کیونکر پیدا کرسکتا ہے، جبکہ وہ تنازع للبقا کی جنگ میں حصّہ نہ لے؟ کسی کو حکمت کی صفت سے کیونکر متصف کیا جاسکتا ہے، جبکہ وہ غریب معاملات سے کوئی علاقہ ہی نہ رکھتا ہو؟ اور اسی طرح عدالت کا مفہوم ہی کب متعین ہوسکتا ہے، جبکہ حسن معاملت سرے سے مفقود ہے؟ یہ سب حیات اجتماعی کے لوازم ہیں اور جبتک ہم اپنی زندگی کو ان لوازم سے خوب وابستہ نہ کرینگے اس وقت تک نہ تو ہماری زندگی اپنی ذات کے محدود دائرہ سے باہر نکلیگی اور نہ ہماری ذہنی قوتیں ترقی کرسکینگی جنکو ہر ساعت اور ہر لمحہ ایک محرک کی ضرورت ہے۔ جو شخص ان لوازم سے جس قدر زیادہ وابستہ ہے اسکے لئے اپنی ذہنی و عملی صلاحیتوں کو استعمال کرنیکا اتنا ہی زیادہ موقع ہے، اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی قوت اور قابلیت دُنیا میں ایسی نہیں ہے جو بغیر استعمال کے ترقی کرسکے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "ہر ایسی مزاحمت اور روک کا خیر مقدم کرو جو تمہارے راستہ میں حائل ہو اور ہر ایسی نیش زنی کا استقبال کرو جو تمہیں بیدار اور بیدار تر ہونے پر مجبور کرے"۔ ظالم نے ان چند لفظوں میں سعی و جہد کا سارا فلسفہ بھر دیا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنے اوپر دانستہ مصائب کو دعوت دو بلکہ وہ کہتا ہے کہ تمہیں اپنے راستہ میں جو چیز بھی حائل ملے اس سے ہراساں نہ ہو بلکہ اپنے لئے بہتر سمجھو کیونکہ جبتک تمہیں حالات سے واسطہ نہ پڑیگا انکو عبور کرنے اور غالب آنے کی قوت پیدا نہ کرسکو گے اور اسی طرح جبتک تمہیں اچھی طرح تازیانے نہ لگیں گے تمہارا دماغ مصائب کو سمجھنے اور راہ چلنے کے طریقے معلوم کرنے کے قابل نہ ہوگا۔

ازالۂ معائب کا طریقہ۔ تربیت محاسن کے لئے ازالۂ معائب کی کوشش مستلزم ہے۔ اسکا بہترین

طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے معائب کو سمجھ لے اور انکے جواب پر محاسن پیدا کرنیکی کوشش کرے۔ ڈاکٹر شالمر کہتا ہے کہ "ہر نیا جذبہ قوت دافعہ کا کام دیتا ہے" ہمفرے کی رائے ہے کہ "کسی خیال کو بدلنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ ذہن کی ایک تصویر دوسری تصویر سے بدلدی جائے" اسی طرح دوسری جگہ لکھتا ہے کہ "کسی خیال کو بالکل فنا نہیں کیا جاسکتا بلکہ ایک دوسرے خیال سے بدلا جاسکتا ہے جو اتنی ہی اہمیت اور قوت رکھتا ہو" مقصد یہ ہے کہ اخلاقی عیوب کو صرف محسوس کرلینا ہی کافی نہیں، اور نہ انکے محض ازالہ کی کوشش کیجاسکتی ہے بلکہ انکو محاسن سے بدلنے کی ان تھک کوشش کرنی چاہیئے۔ اور جب کوئی بُرا خیال یا بُرا ارادہ پیدا ہو فوراً اسکو اچھے خیال اور اچھے ارادہ سے بدلدینا چاہیئے۔ اسکے لئے ترقی باطن بھی ایک حد تک ضروری ہے، اور اس میں انسان مذہب سے مدد لیکر اپنی توجہ کی انگلیوں سے کردار کی نبض دیکھتا ہے، مگر اس میں استغراق انسان کو رہبانیت کی طرف لیجاتا ہے، اس لئے اعتدال ضروری ہے۔

حکمت عملی۔ اوپر کسی جگہ ہم اخلاقی ماحول کے اثرات کی ان مختلف صورتوں پر کچھ بیان کر آئے ہیں جو انفرادی شعور پر وارد ہوتی ہیں۔ جماعتوں کی اخلاقی زندگی کے بالعموم تین مطمح نظر ہوتے ہیں، قیام شعائر، ادائے فرائض اور تکمیل نفس۔ اجتماعی ترقی کے مختلف مدارج میں انہی تین صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی ایک نمایاں ہوکر ظہور کرتی ہے اور جس قوم کا میلان ان میں سے جس کی طرف ہوتا ہے وہ اسی میں ترقی کرتی ہے۔ اچھا شہری اپنی رہنمائی کے لئے حیات اخلاقی کی ان ہی عام صورتوں سے اصول مستنبط کرتا ہے، اور اپنی عقل و دانائی کی مدد سے انکو اپنی عملی زندگی میں استعمال کرتا ہے۔ اس کو ارسطو نے قیاس اخلاقی سے تعبیر کیا ہے جس کا کبرٰے یہ ہے کہ فلاں فلاں شعائر قائم کرنا اور فلاں فلاں احکام کو پورا کرنا، اور صغرٰے یہ کہ فلاں قسم کے فعل سے یہ باتیں حاصل ہوسکتی ہیں اس طرح عام اصول کو سمجھ کر خاص خاص افعال کو ان کے ماتحت رکھنے کی قوت کا نام ارسطو کی اصطلاح میں حکمت عملی ہے اور اس صاحب قوت کا نام حکیم۔ یہی قوت ایک اچھے شہری کا وصف امتیازی ہے۔

کلامِ شرف

مرزا وقارالاعظم حضرت شرف جاورہ

گلشن میں گل و بلبل ہنستے ہیں ہنسلاتے ہیں
یہ رنگ بھی دیکھا ہے سب خاک اُڑاتے ہیں

مجھ ننگِ محبت پر ہوتا ہے کرم اکثر
ٹھکرا کے لحد میری دیکھنے کو ہنساتے ہیں

وہ کون ہے کہ دل آرا میں کون کہ دلدادہ
دل کون؟ کہ شیدائی پھر دل کو ستاتے ہیں

کیا ساز کے پردے میں بیٹھا ہے کوئی چھپ کر
نغمہ کی تجلی میں جلوے نظر آتے ہیں

یہ دم یہ دلاسے تو کیا ہمکو نہیں آتے
کہتے ہیں تو اے قاصد کچھ کر کے بتلاتے ہیں

ظاہر ہیں کہ پردہ میں پرہیز مگر ٹوٹا
بیمارِ محبت پر کچھ رحم تو کھاتے ہیں

توحیدِ وطن داری مسلک ہے تمدن کا
اب سازِ تمنا میں سب دیس بجاتے ہیں

مذکور مرا سُن کر قاصد سے یہ فرمایا
وہ نا؟ جو مرے در پر دیوانے سے آتے ہیں

اے دردِ شکیبائی آ ہم سے گلے مل لے
اب شام ہوئی آخر اب جان سے جاتے ہیں

لو آؤ شرف چل کر اُس بت کو منا لائیں
دستور ہے دُنیا کا روٹھے کو مناتے ہیں

غزل

کوئی اے بیدرد تیری یاد سے غافل نہ تھا
اشکبار آنکھیں بھی تھیں بیتاب تنہا دل نہ تھا

کر دیا مجبور اے بیدرد تیرے درد نے
ورنہ پہلو میں جگہ دینے کے قابل دل نہ تھا

غیر کا پہلو بھی برماتا مرا دل توڑ کر
کیا کوئی چٹکی میں ایسا تیر اے قاتل نہ تھا

شمع مضطر تھی نظر آتے تھے پروانے اداس
رات محفل میں جو تو اے رونقِ محفل نہ تھا

صدق کا بیتاب دل بجلی کا مخزن ہی سہی
تجھکو بھی ظالم سکونِ دل مگر حاصل نہ تھا

صدق جائسی

بدگمانی

محمد صادق انگلستان میں چار سال تک انجنیری کی تعلیم حاصل کرکے ہندوستان واپس آنیکی تیاری کر رہا تھا کہ اسکے ایک ہم جماعت رابرٹ پیرن نے اُسے چند دنوں کے لئے اپنے گاؤں چلنے کو کہا تاکہ وہ انگلستان کی دیہاتی زندگی کے مشاہدات سے بھی بہرہ اندوز ہو سکے۔ رابرٹ پیرن کا باپ کلارک پیرن تقریباً پچیس سال تک مدراس، بنگلور اور میسور کے گرد و نواح میں عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرتا رہا اور اب بوجہ کہنہ سالی اس دینی خدمت سے سبکدوش ہوکر بقیہ ایام سپائی ٹن نامی ایک چھوٹے سے غیر معروف گاؤں کے گرجے میں معمولی پادری کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ سپائی ٹن ایک پہاڑی قصبہ تھا جس کی آبادی دو سو نفوس سے زاید نہ ہوگی اور حیرت تھی کہ ایسی ویران جگہ آبادی اور ریل سے کوسوں دور کیوں انسانی آبادی کے لئے انتخاب کی گئی تھی۔ لیکن جب اس وادی کے خوبصورت سبزہ زاروں، سرسبز لہلہاتے کھیتوں، شگفتہ رینہ درختوں اور خودرو معطر پھولوں پر نظر پڑتی تھی تو وہی غیر آباد، مہذب دنیا سے الگ خطہ رشک گلزار ارم معلوم ہوتا تھا۔ دن کے دو بجے ہونگے، سورج کی ہلکی زریں کرنیں درختوں کی گنجان ٹہنیوں سے چھن چھن کر پادری کلارک کے مکان پر پڑ رہی تھیں۔ ہر چہار طرف امن برس رہا تھا۔ ایک سکوت، ایک خاموشی تھی کہ در و دیوار پر چھا رہی تھی لیکن بجائے اُداسی کے طبیعت میں جوش اور دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ خوبصورت بنگلہ کے برانڈے میں معمر پادری ایک آرام کرسی پر، تمام دُنیا کے گناہوں کے عوض سولی چڑھ جانے والے کی یاد میں آنکھیں بند کئے لیٹا تھا، گھر کے اندر اُسکی حور تمثال لڑکی فلورا موسم بہار کی رنگین تیتری کی طرح اچھلتی، کودتی گلدانوں میں پھول سجا رہی تھی۔ آج دوپہر بعد اُسکا بھائی ایک ہندوستانی دوست سمیت گھر آنے والا تھا۔ وہ کس قدر مسرور تھی یہ قابل فخر میزبانی سپائی ٹن کے کسی آدمی کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس مسرت میں ایک خوف، ایک عجیبی ایک دلچسپی بھری تھی وہ یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ آج ہمارے گھر میں کیا ہونیوالا ہے لیکن ایک معزز مہمان کی آمد کا خیال اُسکے دل میں ایک ہیجان۔ ایک ناقابل بیان خوشی کے انبار لگا رہا تھا۔ فلورا سولہ سترہ برس کی کشیدہ قامت، سفید گلابی رنگت کی نازک اندام لڑکی تھی۔ اسکی آنکھیں بھوری اور بڑی بڑی۔ پیشانی بلند صاف و شفاف۔ ناک چھوٹی نازک اور نہایت دلفریب۔ اسکے لب پتلے اور گلابی رنگ کے تھے۔ اسکی زلفیں بھورا دنگی

اور مضبوط تھی۔ اُسکے سنہرے بال جن پر ریشمی اُون کا دھوکا ہوتا تھا نہایت اہتمام سے سر پر بندھے ہُوئے تھے۔ وہ صبح دس بجے سے کمروں کی صفائی۔ میز کرسیوں اور برتنوں کی ترتیب و درستگی میں مشغول تھی۔ اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی اور ہر لحہ اُسکے بھائی اور غیر ملکی مہمان کے پہنچنے کی توقع تھی۔ ہر بار اُسکے دل میں آتا کہ ہمارا مہمان کس وضع و شکل کا آدمی ہوگا۔ شاید نہایت سیاہ و بدشکل، لیکن دوسرے لحہ میں اُسکی یادداشت اس بات کی خود ہی تردید کر دیتی تھی کہ نہیں رابرٹ نے کئی دفعہ ذکر کیا کہ وہ سیاہ رنگت کا نہیں۔ وہ ایک بہت بڑے امیر کبیر ہندوستانی تاجر کا لڑکا ہے۔ نہایت مہذب۔ خوش خلق اور با مذاق۔ اس تسلسل خیال سے اُسکا خون حدت پاکر اُسکے گلابی رخساروں کو سرخ بنا رہا تھا۔

بالاخر چار گھنٹے کی مسلسل مصروفیت کے بعد وہ تھک کر ایک کرسی میں گر گئی اور گہرا سانس لے کر اپنے سجائے ہُوئے پھولوں کی طرف اطمینان کی نظروں سے دیکھا پھر یکایک اس خیال سے کہ آنیوالے مسافروں کو غسل کے لئے گرم پانی درکار ہوگا وہ کمرہ سے باہر نکل کر بوڑھے ملازم سے کہنے لگی "دیکھو ولیم مہمانوں کے غسل کے لئے گرم پانی فوراً تیار ہونا چاہیئے۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔ جلدی" یہ کہکر برق وش تیزی کے ساتھ اپنے غسل خانہ میں گھس گئی اور نیلے رنگ کا ایک خوبصورت ریشمی لباس پہن کر باہر نکلی تو مکان کے آہنی پھاٹک کے عین مقابل اُسے ایک پہاڑی ٹانگہ رُکتا نظر آیا جس سے اُسکا بھائی اور محمد صادق اپنے اپنے بیگ سنبھالے ہُوئے نکلے۔

ٹانگے کی آہٹ سُن کر بوڑھا پادری کرسی سے انگڑائی لیکر اُٹھا اور فلورا اُسکے نزدیک آکر کھڑی ہوگئی۔ محمد صادق دوہرے جسم کا نہایت مضبوط تیئس سالہ بے ریش و بُرودت نوجوان تھا۔ اُسکی رنگت قدرے سفید اور سرخی مائل تھی۔ اُسکی آنکھیں بالکل سیاہ اور نشیلی معلوم ہوتی تھیں جن میں ایک ناقابل بیان کشش و جاذبیت موجود تھی۔ وہ ایک مکلف فلالین کے سوٹ میں ملبوس اپنے فرنگ نژاد دوست کے ہمراہ خراماں خراماں مکان کے برانڈے تک پہنچا جہاں دونوں نوواردوں نے معمر پادری کو سلام کیا رابرٹ پیرن نے سر سے ٹوپی اُٹھاکر اپنے بوڑھے باپ کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا "اجازت دیجئے کہ میں اپنے دوست میر محمد صادق کا آپ سے تعارف کراؤں" دوسرے لحہ میں کلارک پیرن کا ہاتھ بیدار بخت محمد صادق کے ہاتھ میں تھا کہ رابرٹ نے پھر شگفتہ آواز میں کہا "اور یہ میری چھوٹی ہمشیرہ فلورا۔ اُمید ہے کہ آپ اس سے مل کر خوش ہونگے۔"

محمد صادق نے اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت، جو سالخوردہ پادری کا ہاتھ گرمجوشی سے دبائے تھی، ڈھیلی چھوڑ دی اور ایک معنی خیز نگاہ سے اُس نے فلورا کی شرمیلی آنکھوں کو دیکھ کر ٹوپی اُتار دی اور آہستہ سے ہاتھ ملا کر تعظیماً اپنا سر جھکا دیا۔ حسین فلورا کے دل میں ہندوستانی مسلمان کی نسبت جو شبہات تھے وہ یک قلم کافور ہو گئے۔ کیونکہ بادی النظر میں وہ ایک مہذب انگریز معلوم ہوتا تھا۔ سوائے اسکے کہ اُسکی رنگت زیادہ سے زیادہ ایک اطالی النسل باشندہ سے مشابہت رکھتی تھی۔ اُسکا لباس، اُسکی زبان اور طرز تکلم بعینہ ویسا تھا جیسا کہ خود اُسکے بھائی کا۔ پرتپہرہ لڑکی کا دل دھڑکنے لگا اور اُس کی زبان تالو سے چمٹ گئی۔ بالآخر اس نے نہایت دقت سے کہا۔ "آپ چلئے میں آپکا کمرہ دکھا دوں"۔

محمد صادق نے دوبارہ سر جھکایا اور اُسکی مہربانی و شفقت کا شکریہ ادا کر کے اُسکے پیچھے ہو لیا۔ اُن دونوں کے چند قدم پیچھے رابرٹ پیرن مہمان کی عزت افزائی کے خیال سے چلا آیا۔ فلورا نے ہال کمرہ سے گزر کر شرق رویہ ایک کمرہ کا دروازہ کھولدیا اور تینوں اُس میں داخل ہو گئے۔ محمد صادق نے ایک ہی نظر میں کمرہ کی تمام اشیاء کا جائزہ لے لیا پھر فلورا نے کہا "جس چیز کی آپکو ضرورت ہو بلا تکلف کہدیجئے۔ آپکا گھر ہے"۔ پھر ایک لمحہ سوچ کر کہنے لگی "کیا آپ آج شام میرے ہمراہ سپائی ٹن کی سیر کو چلینگے۔ یہاں سے آدھ میل کے فاصلہ پر ایک نہایت خوبصورت آبشار ہے اور شکار بھی بکثرت۔ پہاڑیوں کے عقب میں سورج غروب ہونیکا نظارہ نہایت سہانا اور نظر نواز معلوم ہوتا ہے"۔ یہ کہکر اُس نے خوبصورت کھڑکی کے کواڑ کھولدیئے جن سے سورج کی کرنیں محمد صادق کے سر پر پڑنے لگیں۔ اس وقت اُسکے خوبصورت بالوں کی نازک مانگ نہایت دلفریبی سے چمک رہی تھی اور اُسکے لبوں پر ایک دلکش تبسم کھیل رہا تھا۔

فلورا کے ان الفاظ نے اُسکے بدن میں ایک حرارت پیدا کر دی۔ اُس نے بھولی بھالی دوشیزہ کے خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھ کر کہا "میں ایسے حسین مقام کو دیکھ کر بہت محظوظ ہونگا"۔

اس اثناء میں محمد صادق اور رابرٹ کا اسباب پہنچگیا تھا اور اول الذکر کا ایک ٹرنک اور دو خوبصورت چرمی بکس ایک مناسب مقام پر کمرہ کے اندر رکھوا کر دونو بھائی بہن باہر نکل آئے۔ محمد صادق نے دروازہ کے آگے پردہ کھینچکر اپنے کپڑے اُتارنے شروع کئے۔ چنانچہ چند منٹ تک آرام کرنیکے بعد اُس نے غسلخانہ میں قدم رکھا جہاں گرم پانی کے علاوہ ہر چیز قرینہ سے اپنے اپنے مقام پر رکھی تھی۔ غسل کر لینے کے بعد اُسے اپنا بدن ہلکا معلوم ہونے لگا کیونکہ اس وقت تک سفر کی کوفت بھی بہت کچھ دور ہو چکی تھی۔ ایک گھنٹہ کامل

طور پر آرام کر لینے کے بعد اُس نے ایک نیا سُوٹ زیب تن کیا پھر گھڑی پر نظر جمائی اور ایک نازک چھڑی سنبھال کر کمرہ سے باہر نکلا خوبصورت بنگلہ کے پائیں باغ میں فلورا اور اُسکا بھائی نہایت شوق سے اپنے مہمان کا انتظار کر رہے تھے کہ محمد صادق نمودار ہُوا۔ فلورا نے اُسے دیکھتے ہی چلا کر کہا "مسٹر محمد صادق۔ آئیے۔ ہم مدت سے آپکا انتظار کر رہے ہیں"! اسکے بعد تینوں ایک پہاڑی سڑک پر ہو لیئے اور آدھ گھنٹہ کے بے تکان سفر کے بعد وہ اس آبشار پر پہنچے جہاں فی الحقیقت مہر عالمتاب کے غروب ہونیکا نظارہ صرف آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی لیکن قلم اس حسین و روح فرد ز منظر کے قلمبند کرنے سے یکسر قاصر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب دامن مغرب میں رو پوش ہونے سے پہلے آبشار کی پاکیزہ اور صاف وشفاف لہروں میں غسل کر رہا ہے۔ اگرچہ محمد صادق اس سے پیشتر وادیٔ کشمیر اور سوئٹزرلینڈ کے مناظر لطیف کا کئی بار لطف اُٹھا چکا تھا مگر اس حسین منظر، اس جلوہ گاہ فطرت نے اُسے مخمور و مدہوش بنا دیا۔ شباب بہار کے شگوفے، معطر و خوبصورت پھولوں کی نکہت بیزیاں، طیور مرغزار کی نغمہ سنجیاں، آبشار گوہر ریز کا ترنم لطیف اور عطر میں بسی ہُوئی ہوائے خوشگوار اس فقید المثال وادی کی فضا کو حسن و لطافت سے یکسر معمور کر رہی تھی۔ اس ہنگامۂ طرب میں اس تلاطم انبساط میں ان تینوں دلدادگانِ بہار کی اُکھڑی ہُوئی سانس مُنہ سے اس طرح نکل رہی تھیں جیسے مضراب کو سازِ موسیقی سے علیحدہ کر لینے کے بعد بھی تاروں کی تھرتھراہٹ سے ایک ہلکی سی گونج پیدا ہو جاتی ہے لیکن جس طرح اُس نغمہ دلربا، اُس ترنم موج خیز سے اُسے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو ایک ثانیہ پیشتر خون میں حرکت، طبیعت میں کیف بیخودی پیدا کر رہا ہو، اسی طرح معلوم ہوتا تھا کہ ان فریفتگانِ حسنِ بہار کے قالب میں جان تو ہے لیکن حرکت اور سانس کو اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ عورت، وہ لطیف کرشمہ فطرت، جس کی برکت سے یہ معمورۂ جہاں آباد و رنگین ہے، ایسے نظر فریب نظارہ میں کس قسم کی دلاویزی پیدا کر سکتی ہے۔ محمد صادق ایک تو خود ہی موسم برشگال کی رنگینیوں سے متکیف ہو رہا تھا کہ فلورا پیرن کے حسنِ شکیب سوز نے اُسکے جذبات وحسیات کی نزاکتوں میں ایک سرور، ایک لطافت، ایک مستی پیدا کر دی۔ اُس سے رہا نہ گیا وہ شعلہ رخسار لڑکی کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا "مس پیرن کیسی حسین وادی ہے، کیسا خوشگوار موسم ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر ان زعفران زاروں اور اس رشک ارم وادی کے نشیب و فراز میں غزالِ ختن کی طرح چوکڑیاں بھرتا پھروں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوس بریں کا کوئی حصہ مہ جبینانِ فرنگ کی دلبستگی اور اُنکو تمنائے بہشت سے بے نیاز کرنے کے لئے یہاں بھیجدیا ہے۔ ان خوبصورت طائرانِ ہوا کی رنگین موسیقیاں مجھے سرشار محبت فطرت کر رہی ہیں"۔

اس وقت تک آفتاب غروب ہوچکا تھا مگر ایک ہلکی سی روشنی اُن پرندوں کو اپنے نشیمن تک پہنچنے میں مدد دے رہی تھی جو دن بھر کی تلاش و تجسس رزق کے بعد بسرعت اپنے اپنے قیامگاہ کی طرف اُڑے جا رہے تھے اور اُس وقت سے پیشتر جبکہ یہ اپنے مکان پر پہنچیں بزمِ انجم آراستہ ہوچکی تھی اور چودھویں رات کا مکمل چاند نہایت تزک و احتشام سے مسندِ فلک پر جلوہ فرما ہو رہا تھا۔

کامل ایک ہفتہ تک محمد صادق، فلورا اور رابرٹ کے ہمراہ اس وادی گل پوش کے خوبصورت مناظر سے بہرہ اندوز ہوتا رہا۔ ایک دن جبکہ فلورا اُسکے ساتھ اکیلی ہی سیر کے لئے گئی تو اُس نے نہایت درد بھری آواز میں کہا "جب میں انگلستان کی سرزمین سے دور ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھونگا تو عورتوں کی صحبت سے یکسر محروم ہو جاؤنگا۔ آہ! کاش کوئی ایسا مصلح معاشرت پیدا ہو جائے جو ہماری تہذیب و تمدن کا رُخ پلٹ دے"۔

یہ سُنتے ہی فلورا کے چہرے پر ایک اضطراب زا استعجاب پیدا ہُوا وہ اپنی خوبصورت پیشانی پر شکن ڈال کر بولی "تو کیا آپکے ملک میں عورتیں ایسی آزاد نہیں۔ جیسے ہیں۔ کیا اُنہیں گھوڑے پر سوار ہونے، ناچنے، بائیسکل پر چڑھنے اور مردوں کی معیت کے بغیر سفر کرنے کی آزادی نہیں۔ کم از کم مجھے تو اس کا یقین نہیں آتا"۔

محمد صادق کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن اُس نے مصنوعی تبسم سے فلورا کی طرف دیکھ کر کہا "اگر اُنہیں ان باتوں سے کسی ایک کی بھی ترغیب دی جائے تو وہ اسے اپنے مذہبی فرائض کی تکمیل و بجا آوری اور اپنی شرم و حیا پر ایک نہایت شرمناک اور ذلیل حملہ تصور کرینگی"۔

"حیرت ہے" دوسرے لمحہ میں پری تمثال لڑکی کے منہ سے نکلا "میرے خیال میں کسی آدمی کو اُنہیں بتانا چاہیئے کہ یہ تمام آزادی کی نعمتیں جو ہمارے لئے باعث مسرت و صحت ہیں، بغیر کسی تصنع و تکلف کے ہماری بن سکتی ہیں"۔

جواں سال مسلمان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی وہ اپنے اضطراب کو چھپا کر دبی آواز میں بولا "آہ! یہی تو میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو اُنہیں اپنے توہمات اور انکے پُر حماقت رسم و رواج سے خبردار کر دے اور اُنہیں بتلائے کہ آزادی کی چند نشاط انگیز گھڑیاں جینا کنجِ تنہائی کی عمر نوح بسر کرنے سے بہتر ہے"۔

یہ سُنتے ہی فلورا ایک گہری سوچ میں پڑ گئی۔ درحقیقت ہندوستانی طبقۂ نسواں کی اس تنگ خیالی

پر اُسے نہایت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکتی تھی کہ کونسے مذہبی احکام ایسے ہو سکتے ہیں جنکی بجا آوری اُنہیں گھر کی چار دیواری میں محبوس رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ وہ خود آزادی کی دلدادہ تھی لیکن خباثت نفس سے اُسکا دامن بے لوث تھا۔ کئی بار سوچنے کے باوجود اُسکے ذہن میں کوئی ایسی بات نہ سما سکی، جو اُسے مطمئن کر دے کہ مردوں کی صحبت میں آزادانہ رہنے سے ایک نوجوان عورت کو کن خطرات کا سامنا ہو سکتا ہے لیکن یکایک کسی خیال کے برق رو تیزی کے ساتھ دماغ میں آجانے کے باعث وہ منہ پھاڑ کر بولی "اگر میں اس قابل ہوتی تو اس نیک کام میں تمہاری ضرور مدد کرتی"

یہ الفاظ کچھ ایسی سادگی اور صداقت کے ساتھ ادا ہوئے کہ محمد صادق کے دل میں خوشی و مسرت کے ساتھ ایک دھڑکن پیدا ہو گئی، اُس نے ہاتھ سے ایک چھوٹا سا پتھر پہاڑی کے نیچے پھینکتے ہوئے کہا "اگر آپ اس معاملہ میں مجھے مدد دے سکتی ہوں پھر کسی قسم کا انکار تو نہ ہوگا"؟

فلورا کے چہرہ پر بے پروائی کی علامات پیدا ہوئیں وہ دونوں ہاتھوں کو دبا کر بولی "آپ جانتے ہیں کہ میں کوئی ایسا کام کرنے سے کبھی دریغ کر سکتی ہوں جس کی تہ میں صنف لطیف کی فلاح و بہبودی مضمر ہو، مگر سوال یہ ہے کہ میں کیونکر کروں"؟

خوبصورت فلورا کے جواب سے نوجوان کے جسم میں دُگنی حرارت پیدا ہو گئی۔ اُسکے خیالات اُسے کسی اور طرف لے گئے۔ چنانچہ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد اُس نے امید و بیم کی کشمکش میں کہا "آپ میری بیوی بن کر میری مدد کر سکتی ہیں"

یہ غیر متوقع جواب سُنتے ہی فلورا نے زہریلے سانپ کی طرح سر اُٹھایا۔ اُسکے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی اور آنِ واحد میں عرقِ انفعال نے اُسکا تمام بدن پسینہ سے شرابور کر دیا، لیکن اس آواز میں ایک خاص التجا تھی جس نے بجائے خفگی کے اُسکے دل میں ایک قسم کا رحم پیدا کر دیا۔ ایسا فقرہ ادا کر دینے کے بعد محمد صادق کے لئے خاموش رہنا درست نہ تھا۔ اُس نے فلورا کے روبرو اُس مقدس کام کا ایک پروگرام پیش کر دیا جو چند ثانیہ پیشتر اُنکے زیر بحث تھا۔ اُس نے بتایا کہ کس طرح وہ اکٹھے رہ کر قوانین آزادی کی نشر و اشاعت کر سکتے ہیں اور میاں بیوی کا سوال وہ اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اُس نیک اور کار عظیم کی خاطر پیش کر رہا ہے جو اُن دونوں کے مد نظر ہے +

اس کام کی اہمیت فلورا کے نزدیک بھی کچھ کم نہ تھی۔ اگر محمد صادق محض اپنی محبت آمیز گفتگو سے

اُس لعبت فرنگ کو مرعوب کرنا چاہتا تو یہ قطعاً ناممکن تھا اور نہ ہی وہ ایسے تعشق انگیز خیالات کے اظہار کا موقع دینا مناسب سمجھتی۔ خود اُسکے نزدیک کسی متمول یا متوسط درجہ کے آدمی کی بیوی بن کر ایک قسم کی "آرام طلب" زندگی بسر کرنا محض حیوانوں کا سا کام تھا۔ وہ کئی سال سے کسی ایسے رفاہ عام کے کام کی تلاش میں تھی جو اُس کو دن رات مشغول رکھے اور اُس کی تمامتر توجہ کو مبذول کرلے۔ وہ کسی ایسی گمنام دنیا میں جاکر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی تھی جہاں اُسے کوئی نہ جانتا ہو اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم سب نیک بن جاؤ اور ایک دوسرے سے محبت کرنا سیکھو۔ وہ موقع جس کی نسبت وہ دن رات سوچتی تھی بالاخر خود بخود اُسکے سامنے آگیا لیکن ایک ہندوستانی، مفتوح قوم کے ایک فرد اور پھر مسلمان سے شادی کرلینا اُسکے بس کا سوال نہ تھا۔ وہ اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں نہایت محویت سے کچھ سوچ رہی تھی کہ پھر وہی پُرخلوص دل سے نکلی ہوئی، وہ محبت و صداقت سے لبریز آواز اُسکے کان میں پہنچی اور اس انداز کے ساتھ کہ اُسکے جواب میں انکار کرنا ناگزیر ہوگیا۔ اُس نے کہا "مس ہیرن ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کام کتنا نیک اور کیسا اہم ہے۔ غور کرو کہ تمہاری آزادی و خود مختاری کی مثال میرے ملک کی مستورات کے لئے کتنی مفید ہوگی۔ کسی غیر قوم کی تربیت و فلاح کے لئے اپنی زندگی وقف کردینا کیا اس سے بھی کوئی شریف تر اور پاکیزہ کام ہوسکتا ہے۔ یہ ایثار یہ قربانی ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی۔ وہ خاص مقدس روحیں جنہیں قسام ازل اس کام کے لئے منتخب کرتا ہے اس مشکل ترین خدمت کی وہی حامل ہوسکتی ہیں"

فلورا کے چہرے پر معاً سُرخی پھیل گئی اور خیالات کے ہجوم نے اُسے کسی فیصلہ پر پہنچنے سے قطعاً محروم کردیا۔ محمد صادق کے چال چلن یا اُسکی شکل و صورت میں اُسے کوئی نقص نظر نہ آتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ اگرچہ محمد صادق ایک غیر ملکی باشندہ ہے مگر اُس سے شادی کرلینے کے بہت جلد بعد اُسکی شکل و صورت سے مانوس اور اُسکے اطوار و عادات کی خوگر ہو جائیگی۔ پھر بھی ایک بدگمانی اس اجنبی مُسلمان کی طرف سے ضرور تھی، وہ اس لئے پیدا ہوئی کہ اُسکا مذہب صرف اسلام ہی کو عیسائیت کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ لیکن اس وقت تک خود اُسکے دل میں محمد صادق کی محبت پیدا ہوچکی تھی چنانچہ اُس نے ان تمام بندھنوں کو توڑ کر کہا "میر محمد صادق میں اس عزت افزائی کی ممنون ہوں۔ لیکن مجھے اس بات پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت چاہیئے۔ کیا آپکے ساتھ شادی کرنے کے علاوہ اور کوئی ایسا طریقہ نہیں ہوسکتا جس سے میں آپکی مدد کرسکوں"

"نہیں" مضطرب آواز کے ساتھ اُس نے منہ پھاڑ کر کہا "بالکل نہیں۔ جو کام آپ ہماری مستورات

میں میری بیوی بن کر سرانجام دیسکتی ہیں وہ کسی دیگر طریقہ سے نہیں ہوسکتا۔ آپ سب سے پیشتر ہمارے خاندان میں ایک حیثیت حاصل کریں پھر میں آپکی تعلیمات، آپکے خیالاتِ آزادی کی تائید کرونگا۔ جب ہمارے ہاتھ کے سینچے ہُوئے نہال پھل لائینگے تو کیا ہمیں ویسی خوشی نصیب ہوسکتی ہے جو ہم میاں بیوی ہونیکی حیثیت میں محسوس کرینگے؟"

آفتاب بسرعت غروب ہوتا چلا جارہا تھا اور اُسکی سُنہری شعاعیں اردگرد کی پہاڑیوں کو روپہلی رنگ دے رہی تھیں۔ اس خیال سے کہ اگر وہ زیادہ دیر تک باتوں میں مشغول رہے تو کھانیکے وقت تک گھر نہ پہنچ سکینگے، فلورا نے ذرا سریلی آواز میں کہا" میں کل صبح تک جواب دے سکونگی"

یہ کہکر وہ کھڑی ہوگئی اور محمد صادق بھی اپنی ٹوپی سنبھال کر اُٹھ بیٹھا۔ دونوں چہل قدمی کرتے گھر کی طرف واپس ہو لئے۔ جب وہ باغ کے بڑے پھاٹک کے نزدیک پہنچے تو محمد صادق نے فلورا کو ٹھیرا کر کہا" صرف ایک بات اَور پوچھنا چاہتا ہوں" یہ کہکر اُس نے محبت بھری نگاہوں سے حور طلعت عورت کو دیکھ کر کہا" کیا ہندوستان کی آب و ہوا سے آپ گھبرا تو نہ جائینگی؟"

"بالکل نہیں" خوبصورت لڑکی نے نہایت شگفتہ آواز میں جواب دیا۔ لیکن محمد صادق کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ اَور بھی کہنا چاہتا ہے کیونکہ یہ کوئی ایسا سوال نہ تھا جس کے لئے وہ خاص طور پر روک لی گئی تھی۔ بالآخر اُس نے نہایت جرات کے ساتھ جی کڑا کرکے پوچھا" کیا آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں؟"

محمد صادق کی تمام عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس نے ایک عورت کے روبرو ایسا فقرہ کہا ہو۔ اگرچہ وہ مختلف مواقعات پر لنڈن، گلاسگو اور انگلستان کے متعدد شہروں کی فیشن ایبل سوسائیٹیوں میں مختلف القماش عورتوں کی صحبت میں رہ چکا تھا مگر آج سے پیشتر اُسے کسی انگریز عورت کے ساتھ شادی کرنیکا خیال بھی پیدا نہ ہُوا تھا۔ جس طرح یہ خاص فقرہ محمد صادق کے لئے نیا تھا اُسی طرح فلورا کے کان بھی اُس سے ناآشنا تھے۔ مگر اُس نے بھولے پن کے ساتھ پُرتبسم ہونٹوں سے جواب دیا" بہت . . . . بڑی"

محمد صادق اور پری چہرہ فلورا کے مابین اس بات کا فیصلہ ہوجانے کے بعد کہ وہ اُسکی زوجیت میں آنے کو تیار تھی بقیہ کام کوئی ایسا دقت طلب نہ تھا۔ پادری پیرن نے بھی اسکی اجازت دیدی اور انگریزی قانون کے مطابق اُنکا عقد ہوگیا اس سمجھوتہ پر کہ ہندوستان پہنچکر شریعت اسلامیہ کے مطابق اُن کا پھر نکاح پڑھا جائیگا۔

ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے پندرہ ہی دن بعد محمد صادق کو اسسٹنٹ انجنیر کی

آسامی مل گئی۔ دو ہفتہ کے قلیل عرصہ میں وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے اتنے عرصہ کی جدائی کے بعد مل کر سیر بھی نہ ہوا تھا کہ ایک ویران پہاڑی علاقہ کا سفر درپیش ہوگیا۔ چونکہ فلورا ہندوستانی زبان سے محض نابلد بغیر محمد صادق کی مدد کے کسی مرد یا عورت کے ساتھ اچھی طرح گفتگو بھی نہ کر سکتی تھی اس لئے اپنے لوگوں میں چھوڑنا اُسے گوارا نہ ہُوا۔ اگرچہ گھر پہنچنے کے دوسرے ہی دن بعد اُن کا نکاح ہوگیا تھا مگر محمد صادق کے تمام رشتہ داروں نے، سوائے اُسکی چھوٹی ہمشیرہ کے، اس شادی کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ اُسکی بوڑھی والدہ اور رشتہ کی دیگر عورتیں اُسکی شادی کے لئے خدا معلوم دل میں کیسے کیسے ارمان لئے بیٹھی تھیں کہ اُنکی توقع کے خلاف لڑکا خود بخود بیاہا ہُوا گھر آگیا جس سے اُنکی جملہ اُمیدوں اور آرزوں پر پانی پھر گیا۔ جس مقصدِ عظیم کو مدِنظر رکھکر محمد صادق نے فلورا سے شادی کی درخواست کی تھی اُسکی کامیابی میں بھی اُسے شبہ ہوگیا۔ اُن چند دنوں میں اُسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ گھر کی کوئی معزز خاتون آزادی و خود مختاری کا سبق پڑھکر پردہ کی قیود سے آزاد ہونے کو تیار نہ تھی۔ ایسے حالات کے گرد و پیش ہوتے ہُوئے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنی انگریزی النسل بیوی کو لیکر فوراً کترو چلا جائے کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ اگر فلورا کو اس بات کا علم ہوگیا کہ جس غرض کے لئے اُس نے اپنا عزیز وطن اور خویش و اقارب چھوڑے اور غیر مذہب اور غیر ملک کے باشندہ سے شادی کرکے ہزاروں فرسنگ کا سفر اختیار کیا ہے اس میں ایسی صریح ناکامی ہوئی ہے، تو یہ امر اسکے لئے باعث ندامت ہوگا۔

دوسرے دن علی الصبح دونوں میاں بیوی کا اسباب باندھا گیا اور وہ گھر والوں سے ایک قسم کی ناراضی کے ساتھ اپنے صدر مقام کی طرف روانہ ہوگئے۔ شام کو چھ بجے وہ آما پور سٹیشن پر اُترے جہاں سے پچیس میل دور کماؤں کی سرسبز بلند پہاڑیوں کے وسط میں اُنکا صدر مقام تھا۔ رات اُنھوں نے ڈاک بنگلہ میں بسر کی اور علی الصبح طلوعِ آفتاب سے پیشتر خچروں پر اُنکا اسباب لادا گیا۔ فلورا ایک ڈانڈی میں سوار ہوگئی اور محمد صادق اسکے ساتھ پیدل ہو لیا۔ پیچدار پہاڑی گزرگاہوں اور دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کرتے وہ شام کے چار بجے کترو پہنچے جہاں ایک مرتفع بلند مقام پر انجینیر صاحب کا سرکاری بنگلہ تھا اُسکے بالمقابل کوئی بیس قدم کے فاصلہ پر ڈاکٹر براؤن کی کوٹھی تھی۔ ان مکانات کے بائیں جانب غربی سلسلۂ پہاڑ پر کلرکوں اور محکمۂ ڈاک کے کوارٹر تھے اور اُس سے نیچے جھیل شکر پر کام کرنیوالے مزدوروں کی سینکڑوں جھونپڑیاں تھیں۔ شکر جھیل جسکا بند بنوانے کی خاطر حکومت ہند نے نصف کروڑ روپیہ منظور کیا تھا ہر تیسرے چوتھے سال اپنی غارتگر طغیانی سے سینکڑوں گاؤں بہالے جاتی تھی اور ہزاروں بیگناہ انسانوں کی قیمتی جانیں ضایع ہو جاتی تھیں

محمد صادق کی کوٹھی سے ایک میل مشرق کی جانب جھیل کے نزدیک ایک بلند پہاڑی پر میجر بارٹن انجینئر انچارج کا خوبصورت بنگلہ اور اُس کا دفتر تھا۔ صبح دس بجے کے قریب محمد صادق اپنے افسر کے سامنے ضروری احکامات و ہدایات کے لئے پیش ہُوا اور سُورج غروب ہونے تک وسیع جھیل کے نشیب و فراز کو دیکھتا رہا۔

محمد صادق کو اپنی نئی آسامی پر کام کرتے چھ ماہ سے زائد عرصہ ہو گیا۔ اس اثناء میں وہ سرکاری عملہ کے تمام آدمیوں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا، اُن سینکڑوں آدمیوں میں صرف ڈاکٹر ہی ایک ایسا آدمی تھا جسکا فلورا کے ساتھ ملنا وہ پسند نہ کرتا تھا۔ ڈاکٹر براؤن اُدھیڑ عمر کا طویل القامت فربہ اندام آدمی تھا۔ اُسکی شلجم جیسی رنگت۔ تنگ پیشانی۔ قدرے نیلگوں چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ لمبی اور خمیدہ ناک۔ مضبوط بیضاوی زنخداں ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کوئی شریف النفس آدمی نہ تھا۔ البتہ اُس کی گفتگو میں ایک خاص جاذبیت اور دلکشی تھی کہ انسان گھنٹوں اُس کی باتیں سُنے اور سیر نہ ہو۔ اُس کا وقت بے وقت فلورا کو ملنا اور سیر کے بہانے ہمراہ لے جانا اُسکے خاوند کو سخت شاق گزرتا تھا۔ ایک دن جب صبح کے ناشتہ سے فارغ ہو کر فلورا کہیں جانے کو تیار ہُوئی تو محمد صادق نے ذرا ترشروئی سے پوچھا" ایں۔ اتنی سویرے کدھر جانیکا ارادہ ہے؟"

فلورا نے مستعدی سے جواب دیا" میں آج ڈاکٹر براؤن کے ساتھ دُور تک اُس پہاڑی نالہ کو دیکھنے جا رہی ہوں جو ہر سال گردونواح کے سینکڑوں مواضعات تباہ و غارت کر دیتا ہے"

نوجوان انجینیر کے دل میں سینکڑوں شبہات پیدا ہو گئے۔ گذشتہ ایام میں وہ ڈاکٹر براؤں کی نسبت نہ صرف میجر بارٹن بلکہ ماتحت عملہ کی زبان سے بھی بہت کچھ سُن چکا تھا۔ اُسکے سینے میں رشک و رقابت کی آگ مشتعل ہو گئی لیکن دلی اضطراب چھپا کر ذرا متحمل لہجہ میں بولا" لیکن پہاڑی نالہ دیکھنے کا یہ کوئی موسم نہیں۔ جھیل کی حالت مخدوش سی ہے۔ نہیں معلوم کہ بند کب ٹوٹ پڑے۔ اسکے علاوہ میں اُس بدطینت آدمی کا تمہارے ساتھ زیادہ ارتباط پسند نہیں کرتا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ نہ صرف صدر مقام بلکہ تمام شریف مجالس میں وہ بدنام و رسوا ہو چکا ہے، کم از کم میں اپنی ذات کے لئے اور اس سے بڑھ کر تمہاری نسبت کسی شخص کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہیں سُننا چاہتا جس سے میری عزت و آبرو میں فرق آئے میں ایسی میل ملاقات کو بند کرنا چاہتا ہوں اور نہایت سختی کے ساتھ، سُنا مائی ڈیئر"

یہ سنتے ہی فلورا کے دماغ میں ایک لحظ کے لئے خون جم گیا۔ وہ ایک مرمریں بت کی طرح کھڑی

رہ گئی۔ کیا یہ وہی آدمی تھا جو آج سے آٹھ ماہ پیشتر اپنی قوم کی مستورات میں آزادی و خود اختیاری کی روح پھونکنے کے لئے اُسکی مدد کا ملتجی تھا اور آج یہ ایک وقت ہے کہ وہ خود اُسے بھی آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے سے روکتا ہے۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ ان ناگفتنی فقرات کا متکلم وہی محمد صادق ہے جو عورتوں کی صحبت میں رہنے کا شائق اُنکے مطالبۂ حقوقِ آزادی کا حامی، اور اُنکی انتہائی قدر و منزلت کا دعویدار تھا۔ فلورا کے منتشر و پراگندہ خیالات ایک عمیق نقطے کی صورت میں جمع ہو گئے اور صرف اس وقت یہ بات اُسے معلوم ہوئی کہ وہ اپنے خاوند کے سامنے کھڑی ہے۔ دوسرے لمحہ میں اُس نے ذرا جرأت آمیز آواز میں جواب دیا "لیکن صادق تمہیں ایسا حاسد اور تنگ خیال نہ ہونا چاہیئے۔ میں خود اپنی حفاظت کرنیکے لایق ہوں مجھے بالکل نادان بچہ مت تصور کرو"

محمد صادق کے دل میں اضطراب کی چنگاری چمک اُٹھی وہ چلا کر کہنے لگا "بس یہی سب سے بڑی بیوقوفی کی بات تمہارے دماغ میں سما چکی ہے۔ جس سے وہ ذلیل ترین آدمی ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ میجر بارٹن کا چپڑاسی ہانپتا ہُوا کمرہ کے اندر داخل ہُوا پھر سلام کر کے کہنے لگا "صاحب بہادر نے بلایا ہے۔ جھیل کا بند ٹوٹنے کو تیار ہے"

یہ سنتے ہی محمد صادق نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور چند منٹوں میں اپنے کپڑے بدل کر باہر نکلا پھر فلورا کی جانب جو ایک مکلف کرسی میں بیٹھی بڑی محویت کے ساتھ کچھ سوچ رہی تھی، مخاطب ہو کر کہنے لگا "فلورا پیاری دیکھو میرا کہا مانو اور ڈاکٹر براؤن سے تمام راہ و رسوم یکقلم موقوف کر دو۔ آج نیچے جھونپڑی میں بھی نہ جانا شمالی پہاڑیوں میں متواتر تین دن سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور بیشمار پانی جھیل میں جمع ہو رہا ہے نہیں معلوم کب اس کا دہانہ پھٹ پڑے۔ خدا محفوظ رکھے سخت طوفان کا خطرہ ہے" یہ کہکر اُس نے اپنی بیوی کی نازک و خوبصورت پیشانی کو چوما اور کسی قسم کا جواب سُنے بغیر بعجلت جھیل کی طرف روانہ ہو گیا۔

تمام دن کی سر توڑ محنت کے بعد سالخوردہ میجر بارٹن نے یہ فیصلہ کیا کہ پانی کی روک تھام اب انسانی قبضہ قدرت سے باہر ہے۔ اُسی وقت تمام مقامات پر تار دے دئے گئے کہ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹہ میں جھیل کا بند ٹوٹ جائیگا۔ مزید دقت یہ پیدا ہو گئی کہ موسلا دھار بارش کوئی کام نہ کرنے دیتی تھی۔ اس وقت شام کے چھ بج چکے تھے اور محمد صادق مینہ میں شرابور گھر پہنچا۔ جب دروازہ کھول کر اندر داخل ہُوا تو ڈرائنگ روم میں اُس نے فلورا اور ڈاکٹر براؤن کو انگیٹھی کے سامنے آگ تاپتے پایا۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سنتے ہی دونو نے پچھلی جانب مُنہ پھیر دئے اور محمد صادق کو خلاف توقع اپنے سر پر کھڑا دیکھنے سے اُن دونوں کی رنگت

فق ہوگئی۔ اُن کا خیال تھا کہ جب جمیل کی حالت ایسی نازک ہے تو تمام عملہ وہیں اپنے خیموں میں رات بسر کریگا۔
کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی محمد صادق نے اپنی ٹوپی اور برساتی اتار کر ایک کرسی پر رکھدی پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا عین انکے مقابل آکھڑا ہوا۔ کمرہ میں اس وقت ایک موت کا سا سکوت طاری تھا البتہ طوفان کی خوفناک صدائیں اس خاموشی میں ضرور مداخلت کررہی تھیں۔ ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد اُس نے ڈاکٹر براؤن کی طرف مخاطب ہوکر کہا "ڈاکٹر صاحب آپ تشریف لے جائیے اور آئندہ کبھی میرے بنگلہ میں قدم نہ رکھیں۔ بس یہی سب سے زیادہ شریفانہ سلوک ہے جو میں آپکے ساتھ روا رکھ سکتا ہوں"

یہ سنتے ہی ڈاکٹر براؤن کے جسم میں رعشہ پڑگیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں میں کپکپی پیدا ہوگئی، اُس نے دھندلی نگاہوں سے مضبوط و جسیم ہندوستانی کو دیکھا اور پاس کی کرسی سے ٹوپی اُٹھاکر کمرہ سے باہر نکل گیا۔ میاں بیوی کچھ عرصہ تک ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔ محمد صادق کے بدن میں اس وقت غصہ و ندامت کی آگ مشتعل ہورہی تھی اور فلورا اپنی عزت نفس کے مجروح ہوجانے سے تڑپ رہی تھی۔ اُسکے نزدیک ڈاکٹر براؤن اُسکے ہموطن اور ہمقوم آدمی کو اس طرح دھتکار کر نکال دینا پرلے درجے کی کمینگی اور نا انصافی تھی، اُسکے حساس دل میں باغیانہ منصوبوں نے ہجوم کرنا شروع کردیا اور اُسکا گرم سانس بڑی تیزی کے ساتھ نکلنے لگا۔ معاً محمد صادق کی نگاہ ایک کتاب پر جا پڑی جو پاس کی تپائی پر رکھی تھی، اُس نے اُٹھاکر اُسکی خوبصورت جلد کو دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ اس قسم کی کتاب سوائے ڈاکٹر براؤن کے اور کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ اُس نے پہلا ورق اُلٹا تو ڈاکٹر کے مخصوص دستخط میں انگریزی کا یہ شعر لکھا نظر آیا ؎

جام شراب و نقل کباب اور تجھ سا دوست
اس دشت کی مثال بہشت بریں نہیں

اُس نے ایکبار پھر کتاب کی جلد کو دیکھا اور دوسرے لمحہ میں کھڑکی کھول کر نہایت غصہ کے ساتھ اُسے پہاڑی کے نیچے پھینک دیا۔ پھر دروازہ بند کرکے کہنے لگا "یہ ہے درحقیقت وہ چیز جو تمہارے دل کو مسموم اور تمہارے دماغ کو مسحور کئے ہوئے ہے"

غصہ و ندامت کے جوش سے فلورا کا چہرہ تمتما اُٹھا، وہ برق رو تیزی کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اُس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اُس کی زبان تالو سے چمٹ گئی تھی لیکن بڑی دقت کے ساتھ اُس نے کہا "صادق۔ اس بات کو جانے دو وہ بالکل بے قصور ہے"

یہ کہہ کر اُس نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے خاوند کی طرف دیکھا مگر محمدؐ صادق نے اس خاموش سفارش کی کچھ پروانہ کی وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آیا اور فلورا کی کلائی پکڑ کر کہنے لگا "بے قصور ہے۔ لیکن جب میں اتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اُسکے ساتھ ہر قسم کے تعلقات چھوڑ دو تو کیا وجہ ہے کہ تم میری بات پر دھیان نہیں دیتیں، کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ آئندہ اُس سے کبھی نہ ملو گی اور اگر تم اس بات سے باز نہ آؤ گی تو یاد رکھو میں اُسے گولی مار دونگا اور تمہیں ـــــــــ تمہیں بھی مار ڈالونگا،،

یہ رعد کی طرح گرجتی ہوئی آواز سُن کر فلورا کانپ گئی اور موٹے موٹے آنسو اُس کے سُرخ رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ ایک سسکی لیکر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "صادق، ظالم، میرا ہاتھ چھوڑ دے۔ میں ایسے ذلیل سلوک کی تم سے کبھی متوقع نہ تھی۔ بس مجھ سے یہ نہیں برداشت ہو سکتا"

محمدؐ صادق نے آہستہ سے اُسکا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہنے لگا "کیا تم وعدہ کرتی ہو"

فلورا نے دونوں ہاتھ ڈھال کی صورت اپنے چہرے پر رکھ لئے جیسے اُسکی مار سے بچنا چاہتی تھی مگر محمدؐ صادق کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اُس نے پھر ایک بار کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا تم مجھ سے وعدہ کرتی ہو؟"

کسی قسم کا جواب دینے کی بجائے وہ بڑی تیزی سے دروازہ کی طرف لپکی اور اُس آندھی و بارش کے طوفان میں باہر نکل گئی۔ محمدؐ صادق ایک لمحہ تک بت بنا اُسکی اُس مجنونانہ حرکت کو دیکھتا رہا پھر دروازہ کے نزدیک آیا اور بجلی کی روشنی میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر براؤن کے بنگلہ کی طرف جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ کمرہ میں واپس آ گیا اور کئی منٹوں تک ساکت بےحس و حرکت کھڑا رہا۔ دوسرے لمحہ میں اُسکے مُنہ سے ایک بلند قہقہہ نکل گیا، لیکن اس قہقہہ سے اُسکی خوابیدہ حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔ اُسکی آنکھیں مجروح چیتے کی طرح چمکنے لگیں اور جوش غیرت سے اُس نے اپنے ہاتھوں کی نرم مٹھیاں بند کر لیں۔ اُسے کبھی گوارا نہ تھا کہ فلورا اُسکی بیوی ہو کر کسی دوسرے آدمی کی پناہ ڈھونڈھے۔ کامل ایک گھنٹہ تک معاملہ کے ہر پہلو کو سوچ لینے کے بعد اُس نے میز کی دراز سے اپنا پستول نکالا اور فلورا کی طرح بارش میں بھیگتا ڈاکٹر براؤن کی کوٹھی کی طرف چلدیا۔ وہاں پہنچ کر اسکے گورکھا ملازم سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ایک میم صاحبہ کے ہمراہ آدھ گھنٹہ ہوا اسی بادوباراں کے طوفان میں پہاڑی نالے کی جھونپڑی میں چلا گیا ہے۔ محمدؐ صادق ابھی کچھ پوچھنے ہی کو تھا کہ ایک زبردست دھماکے کی آواز آئی جیسے سینکڑوں توپیں ایک ساتھ سر کر دی ہوں۔ اُس نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ

جھیل کا بند ٹوٹنے کی آواز تھی اور چند منٹوں میں ایک زہرہ شگاف طوفان آنیوالا تھا۔ وہ کسی خیال کے دماغ میں یکلخت سما جانے کے باعث پہاڑی سے اُترنے لگا اور اندھیرے میں بدقت اپنے کو بچاتا ہوا وہ نالے تک پہنچا مگر اُس میں اس وقت تک بہت زیادہ پانی آچکا تھا اور جھونپڑی کے فوراً تباہ ہوجانیکی اُمید تھی۔ محمدؐ صادق نے حوصلہ وہمت سے اپنے آپکو سرد پانی کی تیز وتند لہروں میں ڈالدیا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ جھونپڑی کے قریب جا پہنچا جہاں ایک طوفانی لالٹین کی مدھم روشنی تیار ہی تھی کہ فلورا اور براؤن اُس میں ضرور تھے، جھونپڑی میں پانی بھر رہا تھا اور چند منٹوں کے بعد اُسکے مکینوں کے غرقاب ہوجانیکی اُمید غالب تھی۔ محمدؐ صادق نے جب اُسکے اندر قدم رکھا تو دونوں سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ڈاکٹر براؤن نے فوراً اُسکے آگے ہاتھ جوڑدیئے پھر نہایت مضطرب آواز میں کہنے لگا "مسٹر صادق۔ خدارا مجھے بچاؤ میں تیرنا نہیں جانتا" یہ کہکر وہ جھونپڑی کے پچھلے حصّہ سے گھٹنوں پانی چیرتا اُسکے سامنے آکھڑا ہوا اور نہایت زاری سے اپنے بچاؤ کی التجا کرنے لگا۔ محمدؐ صادق نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ اب کیا پیش آنیوالا تھا۔ اسکی ایک نگاہ ڈاکٹر براؤن کے چہرے پر تھی اور دوسری فلورا اپنی بیوی کی طرف جو اُس دھندلی روشنی میں سر جھکائے شاید یہی سوچ رہی تھی کہ آخرکار محمدؐ صادق اُن دونوں کو ہلاک کردیگا۔ اس طرح خاموشی کے ساتھ ہر لمحہ ضائع کرنا۔ غرض جان پر کھیل جانا تھا اُس نے وقت کی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر براؤن کی طرف دیکھ کر کہا "ڈاکٹر، اگر میں تمہاری جان بچانے میں کامیاب ہوجاؤں تو اس خدمت کے عوض تم مجھ سے کیا سلوک کروگے؟"

یہ ہیں انسانی طبایع کے تغیرات جو انسان ضعیف البنیان کی جبلی وفطرتی کمزوریوں کا بدیہی ثبوت ہیں صرف چند منٹ پیشتر اپنے ننگ و ناموس کو خطرہ میں دیکھ کر محمدؐ صادق مجروح بھیڑیئے کی طرح جوش انتقام میں اُسکی جان لینے پر آمادہ تھا مگر اب وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اور اُس شریف ترین جذبہ انسانی کی قوت سے مرعوب ہوکر، جسے مبداء فیاض نے ہر ذی روح انسان میں کم وبیش ودیعت کیا ہے اور جسے "ترحم" کے نام سے موسم کرتے ہیں، وہ سب سے پہلے اپنے بدترین دشمن کی جان بچانے پر مستعد ہوگیا۔ تاریک رات میں بادوباراں کے طوفان کے علاوہ جھیل کا پانی بھی بسرعت کہسار کے نشیب و فراز میں پھیلتا چلا جارہا تھا اور تھوڑے عرصہ میں ان تمام کے غرق آب ہوجانے کی قوی اُمید تھی، ڈاکٹر براؤن کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہورہی تھی۔ اُس نے محمدؐ صادق کی خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھ کر نہایت زاری کے ساتھ کہا "کپتان صادق میں تمام عمر تمہارے پاؤں دھودھوکر پیونگا، خدارا وقت ضائع نہ کرو اور میری جان بچاؤ"

"میں یہ نہیں چاہتا" شریف الطبع نوجوان کے منہ سے نکلا "اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تاحیات میری بیوی سے ملنے کی کوشش نہ کروگے تو میں تمہاری خاطر اپنے آپکو خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار ہوں"

اس لمحہ میں پانی کی ایک زبردست لہر نے جھونپڑی کو ہلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مختصر سا چوبی مکان ابھی لڑکھڑا کر بہہ جائیگا۔ اسوقت تک بہت سا خنک پانی جھونپڑی میں آچکا تھا اور ڈاکٹر براؤن کو اپنی زندگی معرض خطر میں نظر آرہی تھی۔ اُس نے دوبارہ چیخ کر کہا "او مسٹر محمد صادق اپنے مقدس پیغمبر کے صدقہ میں میری جان بچاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ تمہارے احکام کی تعمیل میں مجھے کوئی عذر نہیں..... آہ..... آہ..... مجھے بچالو" یہ کہکر اُس نے دونو باہیں مسلمان انجینیر کے گلے میں حمائل کردیں۔ اب وقت ضائع کرنیکا موقعہ نہ تھا اُس نے ڈاکٹر براؤن کو ساتھ لیا اور محض اپنی طاقت جسمانی اور قوت قلب خیال کے بھروسے پر اُس نے خود کو متلاطم ندی کی غضبناک موجوں کے سپرد کردیا۔

فلورا نے جب دیکھا کہ اُسکا خاوند یوں اُسے تنہا موت کے منہ میں چھوڑ گیا ہے۔ اُسکی آنکھوں کی پتلیاں فور خوف سے پھٹنے لگیں اور موت کے خیال نے اُسکا بدن سرد کردیا۔ وہ گھبرائی ہوئی دروازہ کی طرف لپکی مگر پانی کی ایک زبردست لہر نے اُسے پھر واپس جانے پر مجبور کردیا۔ اُس نے نادان بچوں کی طرح چلانا شروع کردیا اور دوسرے لمحہ میں اُسکے منہ سے نکلا۔ "صادق۔ صادق۔ مجھے بچاؤ۔ میں تمہاری بیوی ہوں"۔ مگر طوفان کے شور کے سوا کوئی جواب نہ تھا اور کوئی دیگر صدا اُسکے کانوں تک نہ پہنچی۔ پانی اب اُسکے سینے تک پہنچ چکا تھا اور چند منٹوں میں سر سے گذر جانیوالا تھا۔ اُس نے دھندلی لالٹین کو ہاتھ سے اونچا کردیا پانی بتدریج اندر آرہا تھا اور اُسے رہائی کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ پانی اب اُسکی گردن تک آگیا تھا۔ اُس نے خوف و ہراس سے اپنی آنکھیں بند کرلیں کہ اتنے میں جھونپڑی کا دروازہ کھلا۔ محمد صادق ڈاکٹر براؤن کو چھوڑ کر محض فلورا کے بچانیکی خاطر آگیا تھا۔ پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ اتنا عرصہ خوفناک تاریکی میں جدوجہد کرنے سے اُسکی تمام تر قوت صرف ہوچکی تھی اُسکا سانس پھولا ہوا تھا لیکن اسوقت وہ فلورا کو بچانیکے لئے نہیں بلکہ اُسکے ساتھ مرنیکے لئے آیا تھا۔ ایسی حالت میں کہ اُسکی قوت جسمانی جواب دے چکی تھی وہ اب کسی طرح بھی نالہ کو عبور نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر فلورا کے ہاتھ سے لالٹین لیلی اور اُسکو اپنے سینے سے چمٹا کر بولا "فلورا، میری زندگی، میری محبت" یہ کہکر اُس نے بیوی کے یخ بستہ ہونٹوں کو اپنے منہ کی وساطت سے حرارت بخشنی پھر کہنے لگا "اب ہمارے بچاؤ کی صرف ایک صورت ہوسکتی ہے کیا تم مجھ پر بھروسہ کرسکتی ہو؟"

فلورا نے اثبات میں سر ہلایا کیونکہ اُسکی طاقت گویائی سلب ہوچکی تھی۔ محمد صادق جھونپڑی کے دروازہ کو پکڑ کر اُسکی چھت پر چلا گیا اور دوسرے لمحہ میں اُسنے فلورا کے ہاتھ سے روشنی لیلی اور اُسکا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا پھر پانی کے زور کو دیکھکر کہنے لگا اگرچہ اندھیرے میں پانی کی صحیح قوت معلوم نہیں ہوسکتی تاہم جھونپڑی کے بہہ جانیکا خطرہ ضرور ہے، اگر ایسا ہوجائے تو مجھے چمٹ

نہ جانا میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر تیرنے کی کوشش کرونگا۔ خوش قسمتی سے ہم ندی کے کنارے پر ہیں اس لئے پانی کا دباؤ اس طرف بہت کم ہے"
یہ کہکر اُس نے اپنا ہاتھ بیوی کی کمر میں دیدیا اور اپنے سینے سے لگا کر اُسے گرمی پہنچانے لگا۔

اسوقت تک مینہ اور ہوا کا زور کچھ کم ہو چکا تھا لیکن جھیل کا پانی بسرعت بڑھتا چلا آرہا تھا۔ جھونپڑی موجوں کے تھپیڑوں سے تھر تھر کانپ رہی تھی اور ایک ہی لہر میں نصف سے زیادہ پانی میں غرق ہوگئی۔ فلورا کا دل بیٹھ گیا اُسنے خوف کے مارے اپنا سر محمدؐ صادق کے سینے سے لگا دیا۔ کچھ عرصہ اس حالت تذبذب میں خاموش بیٹھنے کے بعد محمدؐ صادق نے پوچھا "فلورا، میری پیاری، اس وقت کہ ہمارے زندہ وسلامت بچ نکلنے کی کوئی اُمید نہیں کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ ڈاکٹر براؤن کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے اور اس جھونپڑی میں اُسکے ساتھ تم کیوں آئیں؟

"آہ۔ محمدؐ صادق" اُس نے آہستہ آواز میں جوابدیا "میں اُسے اپنا ہم نسل و ہم رنگ ہونیکے علاوہ اور کچھ بھی نہیں سمجھتی تمہاری بدگمانی سراسر بلاوجہ تھی ۔۔۔ چونکہ تم نے کہا تھا کہ تم ڈاکٹر براؤن کو اور مجھے مار ڈالوگے اس لئے ہم دونوں جان بچاکر یہاں چلے آئے لیکن طوفان کے خطرہ سے ہم بالکل آگاہ نہ تھے"

یہ کہتے ہی اُس نے سسکی بھر کر رونا شروع کیا۔ محمدؐ صادق نے پھر پوچھا "فلورا۔ کیا تم مجھے دل سے نہیں چاہتی؟
فلورا کے سینے میں بحر محبت متلاطم ہوگیا وہ آنکھیں بند کر کے کہنے لگی "صادق، میرے سچے عاشق، میں تمام عمر تمہاری محبت اور شرافت پر نازاں رہونگی . . . . "

اُس نے اپنا فقرہ پورا بھی ادا نہ کیا تھا کہ جھونپڑی اپنی بنیادوں سے اُکھڑ کر بہہ نکلی اور بیشمار تنکے ٹہنیاں اور پانی کا میلا کف اُنکے اردگرد چمٹ گیا۔ دونو میاں بیوی نے لکڑی کے تختوں کو مضبوط ہاتھوں سے تھام لیا اور پانی کی رَو کے ساتھ بہہ نکلے۔ دس منٹ کے عرصہ میں وہ بغیر کسی خطرہ کے آدھ میل کے قریب نکل گئے اور خوش قسمتی سے درختوں کے ایک گنجان جھنڈ میں اُنکی جھونپڑی جا اٹکی خوفناک رات کا بقیہ حصہ انہوں نے وہیں بسر کیا لیکن اُجالا ہونے سے پیشتر ہی ڈاکٹر براؤن اور میجر بارٹن سینکڑوں دیہاتی لئے محض لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی کو دیکھ کر وہاں آپہنچے اور بڑی مشکل سے دونوں کو زندہ بچا کر لائے۔

اس جانکاہ واقعہ کے دو سال بعد محمدؐ صادق نینی تال تبدیل ہوگیا۔ ایک صبح جبکہ فلورا اپنے خوبصورت بچے محمدؐ نسیم کو نہلا رہی تھی تو اُس نے محمدؐ صادق کو چھیڑنے کی خاطر کہا "صادق ڈیئر۔ آخر وہ ہمارا آزادی کی تبلیغ و اشاعت کا کام کب شروع ہوگا؟"
محمدؐ صادق مُسکرایا اور اپنی صبح کی ڈاک ہاتھ میں لئے چپکے سے باہر نکل گیا۔

محمدؐ ضیاءالدین شمسی

خیالات

بیکار کیوں بیٹھا ہے

بیکار کیوں بیٹھا ہے؟ اُٹھ اور زندگی کے کاروبار سے حظ اٹھا! ہاں! دُنیا کے جھگڑوں جھمیلوں سے نہیں بلکہ دل انسان کی قدرتی کاروبار سے!۔

تو باغ و صحرا کی جانب چل اور گوشِ ہوش سے سن کہ کیا کیا شیریں آوازیں تیرے دائیں بائیں سے سنائی دیتی ہیں۔ پھر اپنے دل کے آئینے میں دیکھ کہ وہاں کیسا ہنگامۂ جذبات برپا ہے!

بیکار نہ بیٹھ! تو زمین کے سینے میں بیج بو کر اُسے بہتے ہوئے پانی سے سیراب کر اور دیکھ کہ کس طرح تجھ کو نہال تازہ کا تحفہ ملتا ہے۔ تو اُسکو نشو و نما ہوتے نظارہ کر کہ وہ کیسے صبح شام کی ہواؤں میں اطمینان کے ساتھ لہلہاتا ہے۔ پھر انتظار کر یہاں تک کہ تیری محنت ٹھکانے لگے وہ پھل لائے اور تیری مراد پوری ہو اس آب و دانے سے تو اپنی حیاتِ چند روزہ کو قائم رکھ اور غور کر اُس ذات پر جس نے تیری زندگی کے اسباب پیدا کئے اور تیرے دل کو اپنی تلاش کی آرزوئے مسلسل سے لبریز کر دیا!

اے بھائی! صحیح کاموں میں مصروف رہنا ہی زندگی ہے اور بیکاری تو سیدھی موت کی طرف لیجاتی ہے! تو عدم سے عالم میں اسلئے آیا ہے۔ کہ تیری تمام قوتیں مصروفِ کار ہو جائیں: تیری آنکھیں رنگین نظاروں کو دیکھیں اور تیرے کان شیریں آوازوں کو سُنیں تیرا دماغ خوشرنگ پھولوں کی بھینی بھینی نکہت سے مست ہو اور تیری زبان صحیح لذت کے لطف سے متاثر ہو جائے!

تیرے جسم و جان رشتۂ احساس سے باہم ملے ہُوئے ہیں۔ اور یہ دنیا اک عالمِ محسوسات ہے جسکی ہر شئے اثر کرنے والی اور خود اثر لینے والی ہے! ایسے مقام میں رہ کر بیکار بیٹھنا کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اپنے دل کو پاکیزہ نیت کا سیدھا رستہ دکھا اور پھر اچھا بُرا جو تجھ سے بن آئے کر، لیکن تُو کام میں مصروف رہ اور بیکار ہرگز نہ بیٹھ!

د. ر

محفل ادب

مسز کاڈل کا غصہ

(چھتری کے لئے)

(رائے بہادر رادھامن بہار گو سابق کلکٹر جالون)

مسٹر کاڈل نے اپنے ایک ملاقاتی کو اپنی چھتری عاریتاً دیدی یہ بات انکی میم صاحبہ کو ناگوار گذری، جھنجھلاکر بولیں، یہ بڑے دن کے بعد تیسری چھتری جاچکی ہے۔ تم کرتے کیا؟ اُسے اپنے گھر پانی برستے میں جانے دیتے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اُسکے پاس تھا ہی کیا جو خراب ہوجاتا، زکام ہوجاتا؟ بیشک! اُسکی صورت سے تو نہیں ظاہر ہوتا کہ حضرت کو زکام ہوجاتا۔ اور زکام ہوجاتا تو بلا سے ہوجاتا۔ اچھا ہوتا اگر ہوجاتا، ہماری چھتری کیوں لیگیا۔ مسٹر کاڈل! تمکو پانی برسنے کی آواز بھی کچھ سنائی پڑتی ہے؟ سنتے بھی ہو؟ پانی برسنے کی آواز بھی کان میں آتی ہے؟ بیشک آج سینٹ سیوٹن کا دن ہے۔ کیسا کھڑکیوں کے اوپر پانی پڑرہا ہے۔ واہیات مجھے نہ بہکاؤ اس زور کا تو پانی پڑرہا ہے اور تمہیں نیند! سچ بتاؤ! تم سنتے ہو؟ غنیمت ہے کہ تم نے سنا تو۔

ابھی یہ ایک طوفان آیا ہے جو کم از کم چھ ہفتہ رہیگا اور ہمکو گھر سے باہر قدم نکالنا دشوار ہوگا۔ خوب! مجھے بالکل ہی بیوقوف سمجھتے ہو کیا۔ مسٹر کاڈل! مجھے چھیڑو نہیں، وہ اور چھتری واپس کرے؟ لوگ تمہیں کل کا بچہ سمجھیں گے۔ کبھی کسی نے آجتک چھتری واپس دی ہے، جو یہ دیگا۔ وہ دیکھو۔ تم سنتے ہو طوفان بڑھتا جاتا ہے۔ موسلا دھار پانی برس رہا ہے۔ اور چھ ہفتہ تک ہمیشہ چھ ہفتہ تک رہتا ہے۔ اور چھتری ندارد۔

مجھے کوئی یہ تو بتلاوے کہ بچے کل مدرسہ کیسے جائینگے۔ ایسے پانی میں ہرگز نہیں جائینگے، نہیں؟ اس طوفان میں گھر ہی رہینگے چاہے کورے جاہل رہ جائیں۔ بیچارے معصوم بچے۔ ایسے پانی میں بھیگیں اور سردی کھائیں۔ اگر وہ ان پڑھ رہے تو یہ کسکا فعل سمجھا جاویگا۔ اُنکے باپ کا اور کسکا۔؟ جن لوگوں کو خود اپنے بچوں کا ہی کچھ خیال نہ ہو اُنکے اولاد ہی کیوں ہو۔

مجھے معلوم ہے کہ تم نے چھتری کیوں دیدی۔ بلاشبہ میں خوب جانتی ہوں، میں اپنی ماں کے ہاں کل چاء پینے کو جانیوالی تھی۔ یہ تمکو معلوم تھا۔ اور تم نے عمداً چھتری دیدی، زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تمہیں میرا وہاں جانا ہرگز پسند نہیں۔ تم مجھے روکنے کے لئے ایسی ہی خفیف حرکتیں کیا کرتے ہو۔ مسٹر کاڈل تم یہ ہرگز نہ سمجھنا۔ چاہے کیسا ہی موسلا دھار

پانی برسے میں جاؤنگی! ضرور جاؤنگی نہیں میں کرایہ کی گاڑی میں نہیں جاؤنگی۔ یہ تو بتاؤ کرایہ کو دام کہاں سے آئینگے۔ تم اپنی اُس کلب میں ایسی دن کی ہانکا کرو۔ کرایہ کی گاڑی! معقول! کم از کم دو روپیہ کرایہ چاہیئے۔ ایک روپیہ جانیکا اور پھر ایک روپیہ لوٹ کے آنیکا کیا خوب! کرایہ کی گاڑی۔ یہ تو بتائے کوئی کہ کرایہ کس کے گھر سے آئیگا۔ میرے پاس تو ہے نہیں۔ اور خدا حافظ اگر تمھاری بھی یہی حالت رہی تو تم بھی کہاں سے دوگے۔ آئے دن چھتری خریدا کرو اپنی چیز برباد کیا کرو اور اولاد کے لئے کوڑی نہ چھوڑو۔

پانی برسنے کی آواز تمھارے کانوں میں آتی ہے مسٹر کاڈل؟ بتاؤ! سُنتے ہو یا نہیں! مگر خیر۔ اس سے کیا مطلب۔ میں اپنی ماں کے ہاں کل جاؤنگی! ضرور جاؤنگی اور راستہ بھر پیدل جاؤنگی اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میری حالت کیا ہوگی۔ میرے مرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہیگی۔ مجھے ایک بیوقوف عورت نہ کہو۔ بیوقوف تو ہو تم۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں لکڑی کا جوتہ نہیں پہن سکتی۔ چھتری کے بدون اگر میں بارش سے بھیگی تو سردی ضرور لگ جائیگی! اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اُنہہ اگر سردی لگ بھی گئی تو تمہیں کیا پروا۔ میں بیمار پڑوں تمھاری بلا سے۔ اور بیمار پڑنے میں کوئی شک بھی ہے اور پھر ڈاکٹر کا لمبا چوڑا بل آئے تو اچھا ہو تمہیں ذرا چھتری دیدینے کا مزہ تو معلوم ہو۔ تعجب نہیں یہی سردی کا لگنا میری موت کا باعث ہو۔ جی ہاں۔ اور اسی غرض سے تو چھتری دے ہی دی۔ یقیناً

ایسے موسم میں گھسٹتے ہوئے میرے کپڑوں کی کیا گت ہوگی۔ میری گون اور بانٹ کا تو ستیاناس ہی ہوگا۔ بالکل۔ تم یہ کہتے ہو کہ اُنکے پہننے ہی کی کیا ضرورت ہے؟ بیشک مسٹر کاڈل! میں ضرور پہنونگی۔ نہیں نہیں۔ مجھے کیا تمھارا یا کسی اور کا ڈر ہے۔ کہ مثل ایک پھوہڑ اور ذلیل عورت کے جاؤں خدا گواہ ہے کہ میں شادونادر ہی گھر کی دہلیز نانگتی ہونگی، سچ تو ہے کہ میں ایک غلام سے بدتر ہوں مگر یہ سمجھے رہنا مسٹر کاڈل! کہ جب گھر کے باہر قدم رکھونگی تو ایک شریف خاتون کی طرح خدا کی پناہ کیسا پانی گر رہا ہے۔ یہ تو کھڑکیوں کو توڑ کے اندر گھس آئیگا

مجھے تو یہ خوف ہے کہ کل کیا نوبت ہوگی۔ میں حیران ہوں کہ اپنی ماں کے ہاں کیسے جاؤنگی۔ موت کا سامنا ہے۔ مگر جاؤنگی ضرور نہیں میاں نہیں! میں کسی کی چھتری نہیں مانگنے کی اور نہ تم نئی چھتری خریدنے پاؤگے۔ دیکھئے مسٹر کاڈل! یہ بات آپ اچھی طرح سُن لیجئے۔ اگر تم کوئی دوسری چھتری گھر میں لائے تو میں اُسے سڑک پر پھینک دونگی۔ اگر ہو تو میری خاص چھتری ہو ورنہ مجھے ضرورت نہیں ہائے! پچھلے ہفتہ ہی تو میں نے اُس چھتری میں نئی موٹھ لگوائی تھی۔ کاش مجھے یہ خبر ہوتی کہ چھتری کا کیا حشر ہونیوالا ہے تو میں اُسے بلا موٹھ کے رہنے دیتی۔ ہم تو نئی موٹھ میں دام خرچ کریں، اور لوگ ہمارا مضحکہ اُڑائیں۔ اجی تمھاری بلا سے۔ تم چین سے سوؤ۔ تمہیں اپنی بیچاری عورت اور پیارے بچوں کا تو کچھ ہے ہی نہیں تمہیں تو بس ایک فکر ہے کہ اُٹھائی اور چھتری دیدی!

درحقیقت مرد یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ساری خدائی کے مالک ہیں۔ بھلے مالک ہیں! جبکہ ایک چھتری کی یادداشت اُن سے نہیں ہو سکتی۔

بلاشک کل کا پیدل جانا اور آنا میری جان لیگا۔ مگر یہی تو تم چاہتے ہو۔ پھر تو خوشی سے اپنے کلب کو جانا اور جو جی میں آئے سو کرنا لیکن میرے بیچارے بچوں کی کیا گت ہوگی۔ خیر میاں تم تو چین سے رہو گے۔ بہت باتیں نہ بناؤ۔ میں خوب جانتی ہوں تم بڑے چین سے رہو گے۔ یہ بات نہ ہوتی تو تم چھتری دیدیتے۔!

ہاں تمہیں جمعرات کو جانا ہے وہ جو سمن آیا تھا۔ مگر تم جا کیسے سکتے ہو۔ بغیر چھتری کے تم جاؤ گے کیسے، چاہے تمہارا مقدمہ خارج ہو جائے۔ بلا سے۔ تمہارے کپڑے خراب ہوں۔ چاہے تمہارا قرضہ مارا جائے۔ جو لوگ اپنی چھتری دوسروں کو دیدیتے ہیں وہ اسی لایق ہیں کہ انکا قرضہ مارا جائے۔

مجھے یہ تو بتائیے کہ کل میں بغیر چھتری کے اپنی ماں کے یہاں کیسے جاؤنگی؟ تمہیں اس سے کیا، کہ میں کہتی تھی، میں ضرور جاؤنگی، یہ بات اور وہ بات اور میری ماں خیال کریگی کہ مجھے اسکی کچھ پروا نہیں ہے۔ اور جو تھوڑا بہت روپیہ ہمکو وہاں سے ملنے والا تھا وہ بھی گیا گذرا ہوا۔ اور کیوں؟ ہمارے پاس چھتری نہیں ہے۔

اور رہے بیچارے بچے۔ غریب وہ بھی شرابور ہونگے۔ گھر تو خالی بیٹھے رہنے پائینگے نہیں۔

انکے پڑھنے کا ہرج کیوں ہو۔ اپنا ہی لکھا پڑھا کام آئیگا۔ اسکے سوا اور انکا باپ کیا چھوڑیگا۔ یقیناً وہ مدرسے ضرور جائینگے تمہیں اس سے کیا کہ میں نے یہ کہا تھا کہ اب وہ نہ جائینگے۔ کاڈل! تم ناحق بات کا بتنگڑ بناتے ہو۔ تمہاری باتوں سے ایک فرشتہ کا بھی مزاج بگڑ جائیگا۔ بچے مدرسہ ضرور جائینگے۔ خوب کان کھول کے سُن لو۔ اور اگر وہ سردی کے اثر سے مرے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں نے تھوڑے ہی چھتری دی ہے۔

(مسٹر کاڈل اپنی دستی تحریر میں) لکھتے ہیں کہ اسکے بعد انکو واقعی نیند آگئی اور انہوں نے خواب میں دیکھا کہ تمام آسمان کا ایک سبز رنگ کا کپڑا بن گیا، جس پر ہیل مچھلی کی آنتوں کی تانیں لگی تھیں اور درحقیقت تمام دنیا ایک بہت بڑی چھتری کے تلے گھوم رہی تھی ÷

زمانہ

تمام دنیا کو شکرگزار ہونا چاہیئے۔ آنحضرت محمد (صلعم) کی ذات سے جو جو فیض دنیا کو پہنچے انکے لئے نہ صرف عرب (بلکہ تمام دنیا) کو شکرگزار ہونا چاہیئے کون کون سی تکلیفیں ہیں جو اس بزرگ نے نسل انسانی کے لئے اپنے اوپر برداشت نہیں کیں اور کیا کیا مصیبتیں اس کام میں انکو اٹھانی نہیں پڑیں۔ تنگدل اور متعصب لوگ ایسے بزرگ کی نسبت کچھ بھی کہیں لیکن جو انصاف پسند اور کشادہ دل ہیں وہ کبھی محمد (صلعم) کی ان بے بہا خدمات کو جو وہ نسل انسانی کی بہبودی کیلئے بجالائے بھلا کر احسان فراموش

نہیں ہوسکتے اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ پرلے درجہ کے تنگدل اور ناحق شناس لوگ ہیں اسلام کا جھنڈا جو ہمیشہ کیلئے ان کی یادگار رہیگا ان کی فضیلت کا بڑا عالی شان نشان ہے ۔

(شر دھے پر کاش دیوجی)

آہ ہماری کیا کیفیت ہوتی منشیات و مسکرات کو حرام قرار دینا حضرت محمدؐ (صلعم) کا وہ زبردست احسان ہے جس کے بار گراں سے نسل انسانی کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی اقوام یورپ کو اس بارہ میں مسلمانوں پر حسد کرنا لازم ہے۔ اسلامی تعلیم کی برتری فضیلت منزلت اظہر من الشمس ہے۔ اسلام کامل مذہب ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلامی تعلیم بالکل خالص ہے آہ اگر اسلامی تہذیب دنیا میں جلوہ افگن نہ ہوتی تو ہماری کیا کیفیت ہوتی۔ آئین احسانمندی کی رُو سے دنیا پر واجب ہے کہ دنیا پر آپ نے تہذیب و تمدن کا جو حیرت انگیز اثر ڈالا ہے اسکو کبھی فراموش نہ کریں۔

(جرمنی کا مشہور علامہ جوائکیم دی بوائف)

بلاشک حضرت محمدؐ خدا کے رسول ہیں - اگر پوچھا جائے کہ افریقہ (بلکہ کل دنیا) کو مسیحی مذہب نے زیادہ فائدہ پہنچایا یا اسلام نے تو جواب میں کہنا پڑیگا کہ اسلام نے آہ محمدؐ صلعم کو اگر قریش ہجرت سے پہلے خدانخواستہ شہید کر ڈالتے تو مشرق و مغرب دونوں ناقص و ناکارہ رہ جاتے اگر آپ نہ آتے تو دنیا کا ظلم بڑھتے بڑھتے اسکو تباہ کر دیتا اگر آپ نہ ہوتے تو یورپ کے تاریک زمانے دوچند بلکہ سہ چند تاریک تر ہو جاتے اگر آپ نہ ہوتے تو انسان ریگستانوں پر پڑے بھٹکتے پھرتے اگر آپ نہ ہوتے تو عیسائیت بگڑ کر بد سے بدتر ہو جاتی۔ جب میں آپکے جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے اور آپکے تابعدار غلاموں نے جن میں آپ نے زندگی کی روح پھونکدی تھی کیا کیا کارنامے کھلائے تو آپ مجھے سب سے بزرگ تر سب سے برتر اور اپنی نظیر آپ ہی دکھائی دیتے ہیں +

آپنے ابتدائے انتہاء تک یعنی بعثت سے لیکر دار البقا میں جاتے تک اپنے کو صرف نبی ہی کہلایا اور اس سے رتی بھر بھی آگے نہیں بڑھے۔ میں یہ اعتقاد کرنیکی جرأت کرتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ درجہ کے فلاسفر اور سائنسدان اور فضلائے عالی دماغ اور عیسائی ایک دن بالاتفاق تصدیق کرینگے کہ بلاشک حضرت محمدؐ خدا کے رسول ہیں۔

(پروفیسر باسورتھ اسمتھ کی مشہور کتاب محمد اینڈ محمڈنزم)

(ندائے اسلام)

نئی کتابیں

آپ بیتی۔ حجم ۱۰۲ صفحات مصنفہ شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس انسپکٹر آف سکولز ملتان، جنوں پریوں چڑیلوں کے متعلق ایک واقعہ لکھا گیا ہے، آٹھویں جماعت کا ایک طالب علم سعید اپنی بہن سعیدہ کو سناتا ہے، سب سُنا چکنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ واقعہ نہیں بلکہ سعید کا افسانۂ خواب ہے نتیجۃً غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کو یہ تعلیم بھی مل جاتی ہے کہ بھوت پریت کا وجود خیالِ خواب کے سوا کچھ نہیں +

احمد نجومی۔ یہ بھی ایک افسانہ ہے جس میں ایک موچی کا بیوی کے اصرار سے نجومی بننا اور اٹکل کے تیر چلا کر بادشاہ کی وزارت کے عہدے تک ترقی پانیکا دلچسپ حال ہے۔

افسانے کو پڑھ کر ضمناً یہ بھی ذہن نشین ہوجاتا ہے کہ سیانے، نجومی، رمال اور فال نکالنے والے بالکل بے خبر اور عیار ہوتے ہیں انکے دام فریب میں پھنس کر جاہل آدمی اکثر تباہ ہوجاتے ہیں، افسانوں کے ذریعہ توہمات کی اصلاح کا طریقہ اُردو میں ایک مفید جدت ہے، شیخ صاحب اگر افسانہ نگاری کی جانب توجہ فرمائیں تو ملک کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوسکتے ہیں۔ انکی افسانہ نگاری میں ایک خاص امتیاز ہے جو دوسرے افسانہ نگاروں میں کم پایا جاتا ہے وہ یہ کہ وہ جن توہمات کی اصلاح کیلئے افسانہ لکھتے ہیں اسے پڑھتے ہوئے افسانے کی دلچسپی ادھر متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی کہ یہ چیزیں غیر واقعی ہیں پڑھنے والا انہیں یقینی سمجھ کر افسانہ پڑھتا چلا جاتا ہے، اخیر میں اچانک انکشاف سا ہوتا ہے کہ ان چیزوں کا وجود ہمارے بیخبرانہ توہمات کا نتیجہ تھا +

بزم گلشن لاہور۔ الہ آباد کے ایک مشاعرہ کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے یہ مشاعرہ دیوان رادھے ناتھ کول گلشن رئیس لاہور نے اپنے اہتمام میں بمقام الہ آباد منعقد کیا تھا جس میں لکھنؤ، دہلی، الہ آباد، کانپور اور دیگر مشہور شہروں کے شعرا شریک ہوئے تھے اس مجموعہ میں اُن تمام شعرا کی غزلیات اور حضرت گلشن میر مشاعرہ کے کلام کا اک اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ لکھائی چھپائی کیلئے انڈین پریس الہ آباد کا نام لے دینا کافی ہے سرورق پر پریاگ کی تربینی کا دلفریب منظر تصویر کی شکل میں دکھایا گیا ہے دریادل پبلشر نے اسکی قیمت صرف یہ رکھی ہے کہ قدر شناس نظریں اسے مطالعہ کرنیکی زحمت گوارا فرمائیں۔

ذیل پتہ پر درخواست کیجا سکتی ہے

پنڈت مدن موہن ناتھ رینہ ایم اے ایل ایل بی وکیل سرسوتی نواس نمبر ۱۲ البرٹ روڈ الہ آباد